بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب

شمارہ (102) جون-2026 جلد نمبر 19

Tahreek-e-adab vol-19, issue-102 June 2026

Editor مدیر

جاوید انور (ڈاکٹر جاوید احمد) **Jawed Anwar** (Dr.Jawed Ahmad)

cell-0091-9935957330

مجلس ادارت

Editorial board and Peer Review committee

پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.

پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی

Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University

ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہ عربی، باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی

Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)

پروفیسر محفوظہ جان، سابق صدر، شعبہ کشمیری، کشمیر یونیورسٹی

Prof. Mahfooza Jaan(Ex.H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہ اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)

ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا

Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata

ڈاکٹر احسان حسن، شعبہ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی

Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان،،اشتیاق احمد،عرفان عارف،ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Aslam Imadi (Hyderabad)

Ishtiyaq Ahmad (General Secretary, Sir syed society Varanasi)

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,

Dr. Mohd. Qasim Ansari (Asst. Prof. Drpt. of Urdu Banaras Hindu University, Varanasi)

Omar Farooq (Riding House,Kanpur)

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

سال اشاعت: Vol-19(جلدنمبر 19) Year of Publication 2026

شمارہ نمبر Issue-102 June 2026، شمارہ 102۔جون

سرنامہ خطاط:انور جمال Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi

سرورق : Title cover Uzma Screen, Varanasiعظمیٰ اسکرین

فی شمارہ : 200/-Two Hundred rs. per copy دوسوروپے

زرسالانہ : دوہزارروپے(رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمرخریداری(ہند): بیس ہزارروپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0016812 A/C no. 33803738087

State Bank Of India, Branch- Lahartara

Varanasi-221103(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارانسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے نیہا پرنٹنگ پریس، وارانسی سے شائع کرا کر اردو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from Neha Printing Press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

مضامین:

1۔تکلیف میں راحت،توکل اوراعتماد،ناخوشگواری میں خوشگوار پہلو،
کمزوراورطاقتور،مشکل میں آسانی،خوبی تلاش کرو،فطرت کانظام
اقلیت کے لئے خوشخبری مولاناوحیدالدین خاں 6
2۔پریم چندکی کہانیوں میں حقیقت نگاری پروفیسرشاہینہ رضوی 14
3۔سلیمان اریب:ایک خاموش چیخ اسلم عمادی 21
4۔چندر بھان خیال پاپولرمیرٹھی 27
5۔پروفیسرقمررئیس محمدشاہدپٹھان 30
6۔صحیفہءمحبت:ایک جائزہ ڈاکٹرمحمدشمس الدین 42
7۔جگن ناتھ آزادبحیثیت شاعر:
ایک تنقیدی وتحقیقی مطالعہ ڈاکٹرشفیق احمدکٹوچ 52
8۔گوجری ناول کاآغازوارتقاء اعجازاحمدچیچی 59
9۔پروین شاکرکی شاعری ماہِ تمام کے آئینے میں ڈاکٹرمہ جبیں 66
10۔ادب،کلچراورروایت ڈاکٹرمحمدلطیف میر 75
نظمیں: 81
محمدخورشیداکرم سوز،پروین شیر،پرویزمظفر،ڈاکٹرشبنم عشائی
غزلیں: 85
رفیق راز،احمدشناس،عمرفاروق،ذوالفقارنقوی،سہیل اقبال،روبینہ میر

مضامین:

1۔بشیر بدر کی ادبی جہات: عہد حاضر کی غزل کا
ایک تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر شفیق احمد کٹوچ 91
2۔سلطان آزاد: حیات و خدمات محمد سرفراز عالم 103
3۔ذوق کی قصیدہ نگاری: ایک فنی وتجزیاتی مطالعہ صدام حسین 119

افسانے:

1۔مٹھی، اڑان، آسمان وحشی سعید 126
تجزیہ: ڈاکٹر جاوید انور
2۔تلافی نورشاہ 132
3۔سیتا کا بن باس نجمہ عثمان 137

افسانچے:

1۔خواہش، مجرم، وضو، خواب، رانگ سائڈ،
اکسٹرا، درد ڈاکٹر نذیر مشتاق 149

مضمون:

1۔افکارِ شیخ سعدی شیرازی۔۔۔ایک نظر ڈاکٹر محمد ساجر 155

تبصرہ:

درد میں تیرتے پھول۔ مصنف: پرویز مظفر
مبصر: ڈاکٹر افضال عاقل 162

☆☆☆

Takleef Mein Raahat, Tawakkal aur Etmaad, Nakhushgavaari mein Khushgavaar Pahlu, Kamzor aur Taaqatvar, Mushkil mein Aasani Khoobi Talash Karo,Fitrat ka Nizam, Aqalliyat ke liye Khushkhabri

by Maulana Wahiduddin Khan **مولاناوحیدالدین خاں**

تکلیف میں راحت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مایصیب المسلم من نصب ولا وصب ولا ھمّ ولا حزن ولا اذی ولا غم ۔حتی الشوکۃ یشاکھا۔ الا کفّر اللہ بھامن خطایاہ۔(فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۱۰/ ۱۰۷) یعنی جب بھی کسی مسلم پر کوئی تھکان یا دردرنج یا حزن یا تکلیف یا غم پہنچتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی کانٹا چبھتا ہے تو اللہ ضرور ان مصیبتوں کو اس کی خطاؤں کے لئے کفارہ بنادیا ہے۔ یہاں مسلم سے مُراد وہ انسان ہے جس کو حقیقت کی پہچان ہوگئی ہو۔ جو چیزوں کو اس کے صحیح رُخ سے دیکھنے کے قابل ہوجائے، جو خدا کی خدائی کو دریافت کرلے اور اسی کے ساتھ انسان کی انسانیت کو بھی۔

ایسا انسان اپنی حقیقت شناسی کی بنا پر وہ انسان بن جاتا ہے جو ہر آنے والی صورتحال کا صحیح جواب (response) دے سکے۔ ایسے انسان پر جب کوئی چھوٹی یا بڑی مصیبت آتی ہے تو وہ اس کی سوچ کو جگانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ ایسے تجربات کے درمیان وہ اپنے عجز کو دریافت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصیبت کے وقت فریاد اور شکایت کرنے کے بجائے وہ قادر مطلق خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ ان تجربات کے درمیان وہ اپنی حیثیت واقعی ادراک کرلیتا ہے۔ اس معاملے کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ مسلم وہ ہے جو زندگی کے تلخ تجربات کو منفی معنوں میں لینے کے بجائے ان کو مثبت معنوں میں لے سکے۔ مسلم انسان کی یہ صفت اس کے لئے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کا محرک بن جاتی ہے۔ دُنیا کی ہر ٹھوکر اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملے پر ازسرنو غور کرے۔ وہ اپنا احتساب آپ

کرنے لگے۔ اصلاحِ خویش کے اس عمل کا دینی نام کفارہ ہے۔

اسلام کا یہ اصول انسان کے لئے ایک عظیم خوشخبری ہے۔ اس دُنیا میں ہر آدمی کو بار بار مختلف قسم کیم مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ آدمی اگر باشعور نہ ہوتو دنیا کی مصیبت اس کے لئے صرف مصیبت یا تکلیف ہوگی، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ مگر جو انسان صاحب معرفت ہو، جس کے ایمان نے اس کو باشعور بنا دیا ہو وہ اس پوزیشن میں ہوجاتا ہے کہ اپنی تکلیف کو بھی راحت بنا سکے ،اپنے نہیں کو ہے میں تبدیل کر سکے۔ وہ کھونے کو بھی اپنے لے ئ پانا بنا لے۔

اسلام کا یہ تصوّر انسان کے لئے ایک عظیم نعمت ہے، وہ تکلیف کے احساس کو بھی راحت کے احساس میں بدل دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی پر جب کوئی چھوٹی بڑی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کبھی گھبراہٹ میں مبتلا نہیں ہوتا۔ ہر مصیبت کے موقع پر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوجاتا ہے کہ اس مصیبت نے میری زندگی کی کسی غلطی کو میرے اعمال کے ریکارڈ سے مٹا دیا۔ مجھے قصوروار انسان کے مقام سے اُٹھا کر بے قصور انسان کی صف میں پہنچا دیا۔

توکل اور اعتماد

اسلام کی ایک اہم تعلیم وہ ہے جس کو توکل علی اللہ کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر حال میں اللہ کے اوپر بھروسہ رکھنا، اللہ کی رحمت سے کبھی نا اُمید نہ ہونا، قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ ''اور تم اللہ پر توکل کرو، اور اللہ کارساز ہونے کے لئے کافی ہے۔ (الاحزاب ۳□) دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تم اللہ پر توکل کرو اگر تم مومن ہو۔ (المائدہ ۲۳□) اسی طرح قرآن میں اہل حق کی زبان سے کہا گیا ہے کہ ''اور جو تکلیف تم ہمیں دو گے ہم اس پر صبر کریں گے، اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے''۔ (ابراہیم ۱۲□) اسی طرح قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تم اس طرح کہو کہ ''اللہ میرے لئے کافی ہے، بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ (الزمر ۳۸□)

توکل کا عقیدہ اُمید اور یقین کا لازوال سرچشمہ ہے۔ یہ عقیدہ آدمی کو یہ یقین عطا کرتا ہے کہ جہاں تمہاری کوششوں کی حد آجائے وہاں ایک اور ہستی تمہاری مدد کے لئے

موجود رہتی ہے جس کی کوئی حد نہیں ۔ جہاں معلوم اسباب ختم ہو گئے ہوں وہاں نامعلوم اسباب کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذریعہ تمہارا ساتھ دینے کا انتظار کر رہا ہے ۔ جہاں تم اپنی طاقت سے کامیاب نہیں ہوسکتے وہاں تمہارا خدا اپنی لامحدود طاقتوں کے ساتھ تم کو کامیاب بنانے کے لئے موجود ہے ۔توکل کا یہ عقیدہ اہل ایمان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے ۔ وہ آدمی کو یہ یقین عطا کرتا ہے کہ بظاہر حوصلہ شکن حالات میں بھی اس کا حوصلہ نہ ٹوٹے ۔ بظاہر نا اُمیدی کے طوفان میں بھی وہ اپنی اُمید کو برقرار رکھے ۔اس پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک شخص کا اسلام کے عقیدہ پر کھڑا ہونا کوئی سادہ بات نہیں ۔ یہ اٹل حوصلہ کی زمین پر کھڑا ہونا ہے ۔ یہ ناقابلِ شکست عزم کی چٹان پر کھڑا ہونا ہے ۔ یہ ایک ایسی برتر اُمید پر کھڑا ہونا ہے جو طوفانی حالات میں بھی آدمی کو مایوسی سے بچائے رکھے ۔ جو اس کو ہر حال میں عزم وہمت کا پیکر بنائے رہے ۔

ناخوشگواری میں خوشگوار پہلو

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں فطرت کا ایک قانون ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے □
وعسی ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم وعسی ان تحبّوا شیئاً وھو شر لکم واللہ یعلم وانتم لاتعلمون ۔ (البقرہ ۲۱۶□) یعنی ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لئے بھلی ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمارے لئے بُری ہو۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۔انسان ایک ایسی دُنیا میں جیتا ہے جہاں اسکے سوا بے شمار دوسرے اسباب ہیں جو رات دن اپنا کام کر رہے ہیں ۔ موجودہ دنیا میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ زیادہ تر انہیں خارجی اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔اس بنا پر بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو اس کی خواہش یا اس کے اپنے منصوبہ کے خلاف ہو۔ اگر آدمی زیادہ باشعور نہ ہو تو وہ ایسے واقعات کو دیکھ کر گھبرا جائے گا۔ وہ اپنے کو ایک مصیبت زدہ یا ناکام انسان سمجھ لے گا۔

قرآن کے مذکورہ بیان میں ایسے انسان کے لئے ایک عظیم رہنمائی ہے ۔ یہ رہنمائی انسان کو ایک مستقل سکون عطا کرتی ہے ۔ وہ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ مصیبت کے لمحات میں بھی یہ سوچ کر مطمئن رہے کہ اس مصیبت میں بھی یقیناً راحت کا کوئی پہلو چھُپا

ہوا ہوگا۔ وہ انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ مشکل لمحات میں بھی وہ انتظار کی پالیسی اختیار کرے ۔ وہ اپنے ناخوشگوار حال میں ایک خوشگوار مستقبل کا منظر پیشگی طور پر دیکھنے لگے۔

ایسا انسان اپنے اس مزاج کی بناء پر ایک بے پناہ انسان بن جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے وقت یا اپنے وجود کا کوئی حصہ بے فائدہ طور پر ضائع نہ ہونے دے۔ وہ اس المناک انجام سے محفوظ رہے کہ ایک ناخوشگوار صورتحال سے متاثر ہوکر وہ اپنے آپ کو ہلاک کرلے ۔ حالانکہ آئندہ آنے والے حالات اس کے لئے ایسی خبریں لائیں جو عین اس کے حق میں ہوں اور مزید اضافے کے ساتھ ٹھیک وہی ہو جس کو وہ اپنے لئے چاہ رہا تھا۔

کمزور اور طاقتور

حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص کے یہاں دو بھائی تھے۔ ایک بھائی کا کاروبار سنبھالتا تھا اور دوسرا بھائی دینی کاموں میں مصروف رہتا تھا۔ پہلے بھائی نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوسرے بھائی کی شکایت کی اور کہا کہ وہ گھر کے کاروبار میں حصہ نہیں لیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ شاید تم کو اُسی کی وجہ سے روزی مل رہی ہو۔ (لعلک ترزق بہ) اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق ، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنما تنصرون وترزقون بضعفائکم (فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۶ ؍۱۰۵۔۱۰۴) یعنی تم کو جو مدد ملتی ہے یا جو رزق ملتا ہے وہ صرف تمہارے کمزوروں کی وجہ سے ملتا ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ہر گھر میں اور ہر سماج میں ایسے افراد ہوتے ہیں جو بظاہر کمزور ہوتے ہیں، ترقیاتی سرگرمیوں میں بظاہر اُن کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ایسے افراد عام طور پر گھر میں بھی اور سماج میں بھی حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کو اجتماعی زندگی میں عزّت کا مقام نہیں ملتا۔ ایسے لوگ خود بھی مایوسی کا شکار رہتے ہیں اور دوسرے لوگ بھی ان کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک بوجھ سمجھ لیتے ہیں نہ کہ اپنے حق میں کوئی مفید اثاثہ۔ ایسے حالات میں مذکورہ اسلامی تعلیم ایک عظیم سماجی نعمت ہے۔ یہ تعلیم بتاتی ہے کہ خدائی منصوبے کے مطابق ، سماج کی ترقیاتی سرگرمیوں میں ان کمزوروں کا بھی ایک عظیم حصہ ہے۔ کسی سماج میں ان کا وجود خدا کی

رحمتوں کو اس طرف مائل کرنے کا سبب بنتا ہے۔ بظاہر نہ کرنے کے باوجود وہ سماج میں بہت بڑی خدمت انجام دیتے ہیں۔ یہ سادہ طور پر صرف ایک اخلاقی تعلیم نہیں، یہ فطرت کا اٹل قانون ہے، یہ خداوند عالم کا تخلیقی منصوبہ ہے۔ اس حقیقت کا شعور جب کسی سماج کے افراد میں پیدا ہو جائے تو ایسا سماج اپنے کمزوروں کے بارے میں آخری حد تک مہربان ہو جائے گا۔ وہ اپنے کمزوروں کو اپنے معاملات میں برابر کا حصہ دار سمجھے گا نہ کہ محض ایک ایک بے فائدہ بوجھ۔

مشکل میں آسانی

قرآن کی سورۃ نمبر ۹۴ میں بتایا گیا ہے کہ— پس مشکل کے بعد آسانی ہے--- بے شک مشکل کے بعد آسانی ہے (الانشراح ۵-٦) ان الفاظ میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے جس کو خدا نے ابدی طور پر پوری دنیا میں قائم رکھا ہے۔ آدمی خواہ کسی بھی ملک میں ہو، خواہ وہ کسی زمانے میں ہو، خواہ وہ کسی بھی حالت میں ہو، ہر جگہ اور ہر حال میں وہ فطرت کے اس قانون کو کارفرما پائے گا۔ موجودہ دنیا اس ڈھنگ پر بنی ہے کہ یہاں کسی بھی شخص کے لئے ہمیشہ یکساں حالات نہیں ہوتے مگر قرآن میں بیان کردہ مذکورہ فطری قانون بتاتا ہے کہ کسی بھی حال میں انسان کو بددل یا پست ہمت نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ خود خالق عالم کے قائم کردہ اصول کی بنا پر ناموافق صورتحال میں ایک موافق امکان چھپا ہوا ہے۔

مثلاً ایک شخص کا باپ اس کی کم عمری میں انتقال کر جائے تو یہ بظاہر اس کے لئے ایک ناموافق بات ہے مگر اس حادثے کا موافق پہلو یہ ہے کہ باپ کے سائے سے محرومی اس کے اندر خوداعتماد کی صفت جگانے والی ثابت ہوگی۔ ایک شخص غریب گھر میں پیدا ہو تو بظاہر یہ محرومی کی بات ہے مگر اس کا روشن پہلو یہ ہے کہ ایسا آدمی حالات کی بنا پر زیادہ محنت کرے گا اور زیادہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا، وغیرہ۔ اسی طرح ہر مشکل، ہر محرومی اور ہر حادثے میں ہمیشہ ایک نیا اور بہتر امکان چھپا ہوتا ہے۔ ناموافق حالات چیلنج بن کر آدمی کو جھنجھوڑتے ہیں۔ وہ اس کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہیں۔ اس طرح ہر ناموافق جھٹکا آدمی کے لئے ترقی کا زینہ بنتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ معمولی انسان سے اوپر اٹھ کر غیر معمولی انسان بن

جاتا ہے۔

خوبی تلاش کرو

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا یفرک مومن مومنۃ ان کرہ منھا خلقا رضی منھا آخر (مسند الامام احمد بن حنبل ۲ ۳۴۹/) یعنی کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے بغض نہ رکھے، اگر اس کے اندر کوئی ناپسندیدہ خصلت ہوگی تو اسی کے ساتھ اس کے اندر کوئی پسندیدہ خصلت بھی موجود ہوگی۔ اس حدیث میں مومن اور مومنہ سے مُراد مومن شوہر اور مومن بیوی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا تخلیقی نظام ہے کہ کسی ایک مرد اور عورت کو تمام انسانی خوبی نہیں دی جاتی۔ ایک مرد اگر جسمانی حیثیت سے زیادہ طاقت ور ہو تو وہ دماغی صلاحیت کے اعتبار سے کم ہوگا، اسی طرح اگر کوئی مرد دماغ کے اعتبار سے غیر معمولی صلاحیت کا حامل ہو تو وہ جسم کے اعتبار سے ایک کمزور انسان ہوگا۔ اسی طرح ایک عورت کو اگر صورت کے اعتبار سے زیادہ حصہ ملا ہو تو سیرت کے اعتبار سے وہ زیادہ خصوصیات کی حامل نہ ہوگی اور اگر وہ سیرت میں ممتاز ہو تو صورت کے اعتبار سے وہ کوئی ممتاز خاتون نہ ہوگی۔ اس میں استثناء ہوسکتا ہے مگر عام اصول یہی ہے۔ فطرت کا یہی اصول ہے جس کی طرف مذکورہ حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ ایک ایسا اصول ہے جس میں ہر شادی شدہ جوڑے کے لئے کامیابی کا راز موجود ہے۔ شادی شدہ زندگی کی ناکامی کا سبب اکثر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک دوسرے کو بظاہر اپنی مرضی کے مطابق نہیں پاتا، اس لئے وہ اس سے بددل ہوجاتا ہے مگر مذکورہ اصول کے مطابق، اس بدلی کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ فریق ثانی فی الواقع ویسا ہی ہے جیسا کہ فریق اوّل اس کو سمجھ رہا ہے۔ اس طرح کے معاملے میں عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ فریق اول کی رائے یکطرفہ ہوتی ہے۔ وہ فریق ثانی کی شخصیت کے ایک پہلو کو دیکھ کر اس سے بیزار ہوجاتا ہے حالانکہ اگر وہ فریق ثانی کے دوسرے پہلو کو دیکھے تو اس کے بارے میں اس کی رائے بالکل بدل جائے۔ مثال کے طور پر ایک شوہر اپنی بیوی کو ظاہری خصوصیات میں

کم پاتا ہے اوراس بنا پر وہ اس کو ناپسند کرنے لگتا ہے، لیکن اس کو جاننا چاہئے کہ یہی اس کی بیوی کی کل شخصیت نہیں، عین ممکن ہے کہ ظاہری کمی کے باوجود اس کی شخصیت میں اندرونی اخلاقی صفات بہت زیادہ موجود ہوں ۔ اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ کسی خاتون کے اندر سیرت وکردار کے اعلیٰ اوصاف ہونا خاندانی زندگی کے لئے زیادہ اہم حیثیت رکھتا ہے۔

فطرت کا نظام

قرآن کی سورہ نمبر ۹۰ میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بیان ہوا ہے کہ لقد خلقنا الانسان فی کبد (ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے)اسی طرح قرآن میں دوسری جگہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کے بارے میں پیشگی طور پر یہ بتا دیا تھا کہ دنیا میں تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہوگے۔ بعضکم لبعض عدو۔(البقرہ ۳۶)

قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تکلیف (Suffering) موجودہ دنیا کا ایک لازمی حصہ ہے۔ یہ خالق فطرت کا مقرر کیا ہوا نظام ہے۔اس لئے اس کو ختم کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں ۔ یہ انسانیت کے نام قرآن کا ایک عظیم فکری تحفہ ہے۔انسان اگر اس راز کو نہ جانے تو وہ غیر حقیقت پسند بنا رہے گا، وہ غیر ضروری طور پر ہمیشہ یہ کوشش کرے گا کہ وہ اپنے لئے ایک بے مشقت دنیا یا خرابیوں سے پاک سماج (evil-free society) بنا سکے مگر ساری کوشش کے باوجود وہ اس مقصد میں کامیاب نہ ہوگا۔ کیونکہ فطرت کے قانون کے مطابق ایسا ہونا ممکن نہیں ۔مگر جب وہ اس حقیقت کو جان لے گا تو وہ مسائل کے ساتھ جینے کی کوشش کرے گا اور پھر وہ اسی طرح اپنی پسند کی ایک دنیا بنا لے گا جس طرح ایک درخت کانٹوں کے باوجود پھولوں اور پتیوں کے ذریعہ اپنی ایک پُرکشش دنیا بنا لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے مسائل انسان کے لئے مصیبت نہیں ۔ وہ انسان کے لئے ترقی کا زینہ ہیں۔ یہ مسائل انسان کو بیدا کرتے ہیں ۔ وہ اس کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو حرکت میں لاتے ہیں ۔ وہ اس کے جمود کو توڑ کر اس کو مسلسل طور پر زندہ رکھنے کی ضمانت ہیں۔ مسائل زندگی کا لازمی حصہ ہیں ۔مزید یہ کہ وہ ایک مفید حصہ ہیں، نہ کہ کوئی مضر حصہ۔ جو لوگ

اس حقیقت کو جان لیں وہ بے فائدہ چیزوں میں اپنی طاقت کو ضائع نہیں کریں گے۔وہ زندگی کی اعلیٰ تعمیر میں یقینی طور پر کامیاب رہیں گے۔

اقلیت کے لئے خوشخبری

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ □ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللہ مع الصابرین۔(البقرۃ۲۴۹□)یعنی کتنے ہی چھوٹے گروہ ہیں جو بڑے گروہ پر غالب آئے ہیں ، اللہ کے اذن سے ، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔قرآن کی اس آیت میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے،اس قانون کے مطابق اس دنیا میں عدداکثریت والا گروہ اگر بظاہر برتر دکھائی دیتا ہے تو عددی اقلیت والا گروہ امکانی طور پر اس سے بھی زیادہ برتر حیثیت رکھتا ہے۔اس دنیا میں فطرت کا قانون اکثریت سے زیادہ اقلیت کے حق میں ہے۔اس آیت میں اقلیتی گروہ کے لئے یہ خوشخبری ہے کہ اس کو اپنی عددی کمی کی بنا پر نا اُمیدی اور پست ہمتی کا شکار نہیں ہونا چاہئے اس کو چاہئے کو وہ اذن اللہ(قانونِ فطرت)پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے اندر پُرامید سوچ پیدا کرے۔یقینی ہے کہ کامیابی آخر کار اسی کو حاصل ہوگی۔

اقلیتی گروہ کس طرح اکثریتی گروہ پر غالب آ سکتا ہے،اس کا جواب یہ ہے کہ جس سماج میں ایسا ہوتا ہے وہاں اکثریتی گروہ اقلیتی گروہ کے خلاف ایک مسلسل چیلنج بن جاتا ہے۔اکثریتی گروہ زندگی کے ہرمیدان میں اقلیتی گروہ کو للکارنے لگتا ہے کہ اگر تم کو جینا ہے تو ہوشیار ہوجاؤ،تمہاری غفلت تم کو موت کے کنارے پہنچا دے گی۔اکثریت کی طرف سے یہ چیلنج اقلیت کے لئے ایک زَبردست تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ وہ چوکنا ہوکر زیادہ مستعدی اور زیادہ ہوشمندی کے ساتھ اپنا عمل کرنے لگتا ہے۔اکثریتی گروہ کا چیلنج اقلیتی گروہ کے افراد کی فطری صلاحیتوں کو آخری حدتک جگا دیتا ہے۔آیت میں اذن اللہ کا مطلب یہی ہے۔جہاں بھی اکثریت اور اقلیت کا فرق پایا جائے وہاں خود بخود اذن اللہ کا یہ عمل جاری ہوجائے گا اور آخر کار اس کا وہی نتیجہ نکلے گا جس کی نشاندہی قرآن کی مذکورہ آیت میں کی گئی ہے۔

☆☆☆

Prem Chand ki Kahaniyon mein Haqeeqat Nigari by Prof. Shahena Rizvi (Ex. HOD Urdu MGKVP Varanasi)cell-9307380555

پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہء اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیا پیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)

پریم چند کی کہانیوں میں حقیقت نگاری

اردو ادب کی تاریخ میں پریم چند کی اہمیت کی نوعیت پر تو ضرور اختلاف رہے لیکن پریم چند کی اہمیت سے کبھی کسی کو انکار نہیں رہا۔ پریم چند نے اس وقت قلم اٹھایا جب ہندوستان کی سیاست و معاشرت دونوں شکست و ریخت کی منزلوں سے گزر رہے تھے۔ ہندو سماج میں راجہ رام موہن رائے کے دبے دبے اثرات قائم تھے اور ذہنوں میں جگہ بنا رہے تھے۔1857 کے بعد ہندوستان کی سیاسی بساط بدل چکی تھی اور اب س کا بھی ردعمل شروع ہو چکا تھ۔اردو زبان و ادب میں بھی نظریے قائم ہو چکے تھے۔انگریزوں کے تسلط کے ساتھ انگریزی ادب سے تعارف ہوا اور ناول ومختصر افسانوں کا رواج اردو ادب میں ہوا۔داستان نگاری کا دور ختم ہو رہا تھا۔امراؤ جان ادآ حقائق پر مبنی ناول نے حقیقت نگاری کی راہ دکھائی۔ناول و کہانیوں کی مقبولیت بڑھنے لگی۔یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ اردو داں طبقہ تبدیلیاں قبول کر رہا تر ھا۔پریم چند نے اسی روایت کو آگے بڑھایا اور ناولوں کے ساتھ ہی جب انہوں نے کہانیوں کو ذریعہ اظہار بنایا تو ان کے پختہ سیاسی و سماجی شعور نے زندگی کی سچائیوں اور سماج کی پستیوں کی طرف بار بار اشارے کئے۔ساتھ ہی ساتھ ان برائیوں کو دور کرنے کا جذبہ بہت شدومد کے ساتھ موجود تھا اور ان برائیوں کا حل بھی انہوں نے پیش کیا لیکن اپنے وقت اور سماجی اقدار کے دائرے میں رہ کر۔

پریم چند زندگی کی سچائیوں کو گہرائی تک دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔وہ سیاست کی نبض کو پہچانتے تھے۔وہ سماج اور انسانی نفسیات کو سمجھتے تھے۔اگر ان کے ابتدائی کچھ افسانوں کو چھوڑ دیا جائے تو پریم چند کی کہانیاں حقیقت نگاری سے دور نہیں۔ان کی کہانیوں

میں بڑے لطیف اشارے ہوتے ہیں جن میں حقیقتوں کے تہہ در تہہ معنی پنہاں ہیں۔انہوں نے حقیقتوں کا کبھی یک طرفہ جائزہ نہیں لیا۔زندگی کے ہر پہلو کا جائزہ لیا اور صحیح نتائج اخذ کئے ہیں ۔ان کے مسائل خود ساختہ نہیں ہیں بلکہ اس دور کے سیاسی و سماجی مسائل ہیں۔پریم چند کی کہانیاں حقیقت نگاری کے صرف اس ایک پہلو تک محدود نہیں ہیں جہاں فنکار صرف اشارے کرتا ہے،سوال اٹھاتا ہے۔انہوں نے ان سوالوں کے جواب بھی تلاش کئے ہیں اور دئے ہیں۔کبھی جواب کھل کر سامنے آتے ہیں۔کبھی سماجی برائیوں کے غلط نتائج دکھا کر احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔اسی لئے ان کی تخلیقات میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور کارفرما ہے۔

سماج کی تعمیر کا پیغام انہوں نے بار بار دیا ہے۔وہ ہندوستانی سماج کے مزاج کے نبض شناس ہی نہیں تھے۔اس کی اقدار کے مبلغ بھی تھے اور برائیوں کے سخت مخالف بھی۔پھر بھی وہ سماج کو اہمیت دیتے تھے فردِ واحد کو نہیں۔یہی وجہ ہے جب بھی انہوں نے کسی فرد کے مسئلے کا حل پیش کیا ہے تو ہندوستانی سماج کو خیال میں رکھ کر۔یہیں وہ آدرش وادی ہو جاتے ہیں ،انہوں نے کسی ایک فرد کی الگ آواز نہیں اٹھائی ان کے کردار ہمیشہ سماج کے پیدا کردہ مسائل کے شکار ہوتے ہیں اور ان کا فیصلہ زیادہ تر سماج کے موافق ہوتا ہے۔لیکن پریم چند نے مسائل حقیقی اٹھائے ہیں اور ان کی حقیقی تصویریں بھی پیش کی ہیں۔ان مسائل کی اصل وجوہات سے واقفیت بھی ہے بس انقلاب کی اس شدت کی کمی ہے جو سب کچھ پھونک کر اس خاکستر سے اپنی دنیا پیدا کرے۔ان کی حق گوئی میں کوئی شبہ نہیں۔اسی حق گوئی کی وجہ سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ" سوز وطن" حکومت کی نظروں میں ضبط کرنے کے لائق تھا کیوں کہ ان کی کچھ کہانیوں میں حکومت کی نقصان دیہہ پالسیوں ،سماجی و معاشرتی پستیوں پر گہرے ومعنی خیز اشارے جگہ جگی ملتے ہیں۔

پریم چند کی کہانیوں کے کردار دیہات کے پس منظر سے ابھرتے ہیں۔ان کے مسائل بھی عام انسانوں کے مسائل ہیں۔کچھ تاریخی کہانیوں کو چھوڑ دیا جائے تو (ان کہانیوں کو بھی پریم چند نے حب الوطنی کے جذباتکے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے۔مقصد شاہی شان و شوکت کا ذکر کرنا نہیں ہے۔) کسان اور متوسط طبقے ہی ان کا موضوع رہا۔ان کی کہانیوں میں یکسانیت نہیں ہے۔پریم چند ماضی پرست بھی نہیں ہیں۔انہوں نے اپنے دور کے مسائل سے

نہ منھ چھپایا نہ ان کا حل ماضی میں ڈھونڈھنے کی کوشش کی۔ان کا آدرش وادبھی اپنے زمانے کے اقدار کا نمائندہ ہے جس میں ہمیشہ مستقبل کی ایک ہلکی جھلک موجود رہتی ہے۔ ہر ادیب کا ذہنی ارتقاء ہوتا ہے۔ پریم چند کا بھی ہوا کیا، یہ بات قابل ستائش نہیں کہ ان کا ذہنی ارتقاء صحیح سمت میں ہوا۔انہوں نے ہندوستانی سیاست کی ان کمزوریوں کو بھی سمجھ لیا جن کی وجہ سے ہندوستان غلام ہوااوراس بےحسی کا بھی احساس تھا جس نے پورے ہندوستان کوسیاسی طور پر مفلوج بنا دیا تھا اور جس کا اثر ہمارے سماج اور معاشرے پر پڑ رہا تھا اور جس کا اظہار انہوں نے شطرنج کی بازی میں کیا۔ یہاں انہوں نے کوئی حل پیش نہیں کیا لیکن کہانی میں لطیف اشارے اور انجام سب کچھ کہہ گئے اور ساری برائیاں بھی اجاگر کر گئے اور یہ بھی احساس دلا گئے کہ تبدیلی کہاں لانی ہے۔

ان کی دوسری کہانیاں بڑے بھائی صاحب،عیدگاہ،دوبہنیں،پنچ پرمیشور،گلی ڈنڈا ،روشنی،پوس کی رات،بڑے گھر کی بیٹی،کفن کبھی اتنی کامیاب کہانیاں ہو ہی نہیں سکتی تھیں اگر انسانی نفسیات کی صحیح سمجھ نہ ہوتی اوران میں حقیقت نگاری نہ ہوتی۔دیکھئے ادب کے موضوعات نہ کبھی نئے ہوتے ہیں نہ پرانے کیوں کہ زندگی کی حقیقتیں ہمیشہ قائم رہتی ہیں۔ان کے روپ بدل سکتے ہیں حقیقتیں نہیں۔اور پریم چند نے حقیقت کے اسی سوتر کو سمجھ لیا تھا۔خیر وشر کا تصادم ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا۔جبر وظلم ہمیشہ اپنے پنجے پھیلاتا رہا اور مظلوم ہمیشہ اس سے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔یہ کشمکش ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔فنکار ان حقیقتوں کو سمجھتا ہے یا انہیں اپنی تخلیق میں کیسے برتتا ہے اوراس کی Approach کیا ہے۔اسی سے کسی تخلیق کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔فنکار کا سیاسی،سماجی ومعاشری شعور جتنا پختہ ہوگا زندگی کی طرف اس کا رویہ اتنا ہی مثبت ہوگا۔اس کی تخلیق اتنی ہی پائدار ہوگی ۔زندگی وفن کے ساتھ ایمانداری ضروری ہے۔ پریم چند کی کہانیوں میں باتیں ہوا میں نہیں کہی گئیں۔ پریم چند نے ہمیشہ ان موضوعات کو چنا ہے جو ان کے قبضہ ءقدرت میں،جو ان کے ذہن میں واضح ہیں۔اسی لئے پریم چند کی بیشتر کہانیوں میں دیہات سانس لیتا ہے جس کو وہ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے۔

پریم چند کی صرف نمایاں کہانیوں کا ہی تجزیہ کرنے کے لئے بھی ایک کتاب درکار ہوگی۔کسی بھی تخلیق میں فنکار کا نظریہ ہمیشہ کارفرما رہتا ہے۔پریم چند کی کہانیوں میں ان کا

حقیقت پسند رویہ ہر جگہ موجود ہے حقیقت کا ادراک ہونا ہی بہت بڑی بات ہے۔زندگی کی حقیقتوں کے اتنے اسرار ہیں اور ساری سچائیاں بھی ایک دم سے منکشف نہیں ہوتیں ہم یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ پریم چند ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے سے پہلے حقیقت کی سمجھ نہیں رکھتے تھے یا ان کی کہانیوں میں حقیقت بیان نہیں ہے۔اس بنیادی حقیقت کو انہوں نے بہت جلد سمجھ لیا تھا کہ زندگی تصادم اور کشمکش سے ہی قائم ہے۔مرکس کے جس نظریے کی نمائندگی ترقی پسند تحریک کرتی ہے اور زندگی وسماج کو جس طریقے سے دیکھنے کی وکالت کرتی ہے۔پریم چند نے بھلے ہی ان خیالات کو واضح طور پر بیان نہ کیا ہو لیکن زندگی کی طرف ان کا رویہ ترقی پسندانہ ہی تھا۔کیوں کہ حقیقت کا اعتراف ہی ترقی پسندی کی بنیاد ہے۔پریم چند نے اس حقیقت کو سمجھا ،مانا اور برتا۔ترقی پسند اصولوں میں تھوڑی نرمی برتی جائے تو پریم چند شروع سے ہی اس نظریہ کے حامی نظر آتے ہیں ورنہ پوس کی رات میں یہ جملہ بھی نہ ملتا:

" مجبوری ہم کریں اور مجا دوسرے لوٹیں"

میں یہاں ان کی دو کہانیوں کا مختصر تجزیہ پیش کروں گی۔جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ پریم چند کسی ایک نظریہ کی حمایت کرتے کرتے کسی دوسرے نظریے کی طرف نہیں مڑتے ہیں بلکہ ان کے ایسے نظریوں کو ایک واضح راہ مل جاتی ہے، جب وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو جاتے ہین۔ان کی کہانی " بڑے گھر کی بیٹی" ان کی ابتدائی کہانیوں میں شمار ہوتی ہے اور " کفن" آخری مطبوعہ کہانی ہے لیکن ان کے ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ اجلاس کے صدر بننے سے پہلے لکھی گئی ہے۔ہمیں اس پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔دونوں کہانیوں کا پس منظر دیہات ہے لیکن دونوں دو الگ الگ طبقوں کی کہانیاں ہیں لیکن پھر بھی کہانیاں حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔" بڑے گھر کی بیٹی" میں زندگی کے اس پہلو کی طرف بار بار اشارے ہوئے جو ہندوستان کی سیاست وسماج میں تبدیلیاں لاتا ہے۔کہانی میں تاریخ وزمانے کے اتار چڑھاؤ کی سمجھ و پرکھ موجود ہے۔ہمارا سماج اس وقت جس شکست وریخت سے گزر رہا تھا۔اس میں پریم چند نے کہانی کے مسئلے کا حل سماج کی پرانی اقدار میں تلاش کیا ہے۔جو تعمیری ہے اور اس وقت کا زیادہ قریب کا حل ہے۔لیکن پریم چند کا پختہ شعور سماجی تبدیلیوں اور سیاسی کشمکش سے آگاہ ہے ،اسی لئے انہوں نے زندگی کے تضاد سے سے اس کہانی میں رنگ بھرے ہیں

۔انہوں نے دو الگ الگ سماجی رتبے کے خاندانوں کی تصویر پیش کی۔ دونوں کے پس منظر کو بیان کر کے انہوں نے ایسی حقیقی تصویر پیش کی ہے جس سے ان کا رہن سہن زندگی اورنظریہء اخلاقی قدروں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ بینی مادھوسنگھ ایک معمولی متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔اس کی تصویراس طرح پیش کرتے ہیں۔

" کہتے ہیں اس دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا۔اس ہاتھی کانعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی۔ کیوں کہ ہروقت ایک آدمی ہانڈی لئے اس کے سر پرسوار رہتا تھا۔"

دیکھئے لطیف طنز اور اس تضاد کو جو ایک طرف یہ بھی بتاتا ہے کہ بھینس کے جسم پر گوشت نہیں کیوں کہ ضرور یا تو وہ بوڑھی تھی یا پھر بھر پور غذا نہیں پاتی اور دوسری اس طبقے کی مجبوری دیکھئے کہ اس بھینس سے جتنا ممکن ہو فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔اس کی ضرورت مقدم ہے۔

آنندی کے باپ بھوپ سنگھ ایک خوشحال متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن پریم چند کی نظر میں اس خوشحالی کے پیچھے چھپی ہوئی اس طبقے کی وہ حیثیت و ذہنیت بھی روشن ہے جو اس کو قرض میں ڈبوئے ہوئے ہے اور ہم پریم چند حقیقت کے اس تضاد کی طرف اشارہ کئے بغیر نہیں رہتے۔ وہ سچائی بیان کرنے میں تو صاف گو ہیں لیکن اس بات کا خیال ضرور رکھتے ہیں کہ ان کی حقیقت بیانی سچائی تو بیان کردے لیکن جتنا ممکن ہو سکے دل شکنی نہ کرے۔

"اس کے باپ ایک چھوٹی ریاست کے تعلقہ دار تھے۔عالیشان محل،ایک ہاتھی تین گھوڑے ، پانچ وردی پوش سپاہی ،فٹن، بہلیاں،شکاری کتے، باز بحری،شکرے،فرش فروش،شیشہء آلات،آنریری مجسٹریٹی اورقرض جو ایک معزز تعلقہ دار کے لوازم ہیں۔وہ اس سب سے بہرہ ور تھے۔"

پریم چند نے اس کہانی میں حالات کا تضاد، زمانے کا تضاد اور انسانی نفسیات کے تضاد کی حقیقت سے کہانی کے تانے بانے تیار کئے ہیں۔سری کنٹھ اور لال بہادر سنگھ سگے بھائی ہیں لیکن دونوں کے سوچنے کا ڈھنگ ہی الگ ہے۔دونوں کی ظاہری صورت دونوں کی اصلیت کی گواہی دیتی ہے۔ان کے سوچنے کے ڈھنگ ہی نے ان کے کرداروں میں تضاد پیدا کردیا ہے اوراسی تضاد کے تصادم سے کہانی میں ارتقاء بھی ہوتا ہے اور روانی بھی آتی ہے۔لال

بہادر سنگھ کا نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

" بھرا ہوا چہرہ، چوڑا سینہ، بھینس کا دوسیر دودھ تازہ ناشتہ کر جاتا۔"

دوسری طرف سری کنٹھ ہے۔

" ان ظاہری خوبیوں کو انہوں نے دو انگریزی کے حروف بی۔اے۔ پر قربان کر دیا تھا۔انہیں دو حرفوں نے ان کے چہرے کی کشادگی، قد کی بلندی اور چہرے کی چمک سب ہضم کر لی۔"

نظریے میں ارتقاء ہوا ہے۔اور ایک باضابطہ اصول و فلسفہ ہی اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے جو اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ سماج کا ایک جابر طبقہ ہمیشہ کمزور طبقے کا استحصال کرتا ہے جس کے نتیجے میں مادھو اور گھیسو جیسے لوگوں کا نظریہ زندگی کی طرف اتنا انتہا پسند ہو جاتا ہے اور انہیں اتنا کاہل بنا دیتا ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ پریم چند نے اس افسانے میں کوئی مقصد نہیں رکھا ہے۔ یہ کردار دبے کچلے تو ضرور ہیں لیکن ان کے اعمال ہمدردی کے نہیں بلکہ نفرت کے قابل ہیں۔ضرور قاری کو ایسا ہی محسوس ہوتا اگر پریم چند کے اس افسانے میں اوپر ذکر کیا گیا ،اقتباس نہ ہوتا جس نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ وہ ایسے کیوں ہیں۔ ہندوستانی سماج کی کن برائیوں کے دباؤ نے انہیں ایسا بنا دیا ہے۔یہی پریم چند کا مقصد ہے کیوں کہ اب ان کو اپنا مقصد بتانے کا اور بہتر طریقہ معلوم ہو گیا تھا۔ادیب بھی سماج میں رہ کر ردوبدل کی مسلسل منزلوں سے گزرتا ہے،اس لئے فنکار کے فیصلے صحیح اور عقل پر مبنی ہوں گے۔اس کی تخلیق میں جتنی تہہ داری ہوگی اتنی ہی اس کی قدر و قیمت زیادہ ہوگی۔" کفن" میں انہوں نے کوئی حل نہیں پیش کیا لیکن اس کی وجہ کی طرف معنی خیز اشارے بھی کر دئے جو ہندوستانی سماج کے لئے لعنت ہے اس لئے اس کو بدلنا چاہئے۔جس طرح گھیسو اور مادھو جلتے ہوئے آلوؤں کو جلدی جلدی کھاتے ہیں تا کہ دوسرا زیادہ نہ کھائے، جس طرح سے بدھیا کے مرنے کا انتظار کرتے ہیں تا کہ چین سے سو سکیں ور جس طرح اس کے کفن کے لئے ملے پیسوں سے شراب و گزک پیتے دکھائی ہیں، اسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ انسانیت سے پرے ایسا کام کوئی کیسے کر سکتا ہے لیکن وہ جس غریب طبقے کے کردار ہیں ان کے یہاں ان قدروں کا وجود تو دور ان کو اس پر سوچنے تک کی نہ تو فرصت ہے اور نہ ضرورت، اسے تو زندہ رہنے کے لئے قدم قدم پر سخت محنت کرنی پڑتی ،اپنے ہی ہی طبقے کے لوگوں سے چھیننا پڑتا۔

یہ بات الگ ہے کہ اس کی لوٹ کھسوٹ بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے تک محدود ہوتی ہے۔ وہ اپنے حالات کو اسی طرح قبول کر لیتے ہیں جیسے ان کے سامنے آتے ہیں۔ زندگی اور موت ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور اگر آرام وعیش کے لئے ان کے پاس دولت نہیں تو محنت سے تو بچا ہی جا سکتا ہے جس سے آرام ملے، جیسا کہ مادھو اور گھیسو کرتے ہیں۔ عورتیں بدھیا کی طرح محنت کرتی ہیں کیوں کہ ان کے مرد کاہل اور آرام طلب ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو محنت کرنا ہے اور ذرا سے حالات ناسازگار ہوں تو بدھیا کی طرح مر جانا ہے جس کو وہ ایک اٹل حقیقت کی طرح مان لیتے ہیں اور پریم چند کی حقیقت نگاری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆

Suleman Areeb : Ek Khamosh Cheekh by Aslam Imadi (New Jersey)
اسلم عمادی (نیوجرسی، امریکہ) USA cell-001-732-207-9739

سلیمان اریب ۔ ایک خاموش چیخ

سلیمان اریب کی شاعری میں عجیب سی نادر اور فن کارانہ صناعی ہے، اس کی لفظیات 'حیرت پیدا' ہیں لیکن اس کو آپ گہری نگاہ سے پڑھیں تو چپکے چپکے دل میں اترنے لگتی ہے۔ سلیمان اریب کے لہجے میں خلوص کی بے انتہا تپش ہے اور اظہارِ ذات کا کھلا ہوا آئینہ ! میں اریبؔ کو ایک انسانی عارف مانتا ہوں ۔ انسانی عارف اور Humanist میں ایک بنیادی فرق ہے ۔ ہیومنسٹ اخلاقیات اور سماجیات کی نگاہ سے انسانی مسائل کا مطالعہ کرتا ہے، درد سمجھتا ہے ، درماں کی تلاش کرتا ہے ۔ لیکن انسانی عارف کوئی فرشتہ صفت منعم نہیں ہے ۔ وہ تو ایک عارف ہے جو ہر کردار میں خود کو پوشیدہ کرتا ہے پھر سوچتا ہے ۔ کہ اس پر ایسی کیفیت کے کیا اثرات ہوں گے ۔ اریبؔ ایک ایسی زندہ انا کا نام ہے جو شکستہ کشتی پر سوار ہے جو موت کے ساحل کا انتظار کر رہی ہے ۔ ہر لمحے کو گنتی رہتی ہے کہ نہ جانے کون سا لمحہ اسے ساحل پر پہنچا سکے ۔ اس فولاد کو ماحول، آب و ہوا اور صحت نے پگھلا کر سرخ کر دیا ہے ۔ وہ کہتا رہتا ہے ۔

کن حرفوں میں جان ہے میری
کن لفظوں پر دم نکلے گا

سوچ رہا ہوں

ابجد ساری یاد ہے مجھ کو
لیکن اس سے کیا ہوتا ہے   (آخری لفظ پہلی آواز)

موت نئی شاعری میں ابدیت کی علامت کے طور پر استعمال کی جاتی ہے ۔ لیکن سلیمان اریبؔ کی ''موت'' صرف جذب و نشہ میں ڈوبی ہوئی خاموشی ہی نہیں بلکہ ایسی موت ہے جو زندگی کے لمحہ لمحہ قتل سے انجام پاتی ہے ۔ یہ موت انسان کے خالی اور بے معنی ہوجانے

کے احساس سے روح پر طاری ہو جاتی ہے۔ اریبؔ چاہتے تھے کہ کاش موت اس کرب سے انھیں نجات دلا دے جسے وہ نئی زندگی میں دیکھتے اور محسوس کرتے تھے۔ انھیں عرفان تھا کہ نیا انسان اندر سے اتنا خالی ہو گیا ہے کہ چند حیوانی خصوصیات کے سوا نہ انسان کی مٹی میں وہ رس رہ گیا ہے نہ ہی رچاؤ۔ مذہب اور اصول کے نام پر قتل اور فسادات انسان کی آدم خوری کی بدترین مثال ہیں۔ آخر عقل اور سائنسی ماحول میں انسان اتنا زہریلا کیوں ہو گیا ہے۔ اس حالت میں اریبؔ خود کو رکھ کر سوچتے ہیں۔ ان کے پاس تہی دستی کے سوا کچھ نہیں؟ وہ مسیحا نہیں؟ بس چونک کر کہتے ہیں:

میں خود سے مایوس نہیں ہوں
انسان سے مایوس ہوں تھوڑا
آج ہی سارے اخباروں میں خبر چھپی ہے
اس دھرتی کے اک حصے
گجرات میں اس نے
میرے منھ پر تھوک دیا ہے

نظم کا کچھ ایسا لہجہ ہے کہ آپ کو یقین ہوتا ہے کہ جس سلیس تخلیق کو آپ پڑھ رہے ہیں وہ شعلہ ہے، صرف نظم ہی نہیں !

سلیمان اریب اپنی کہانی نہیں کہتے، وہ اپنے بنائے ہوئے کرداروں کی کہانی کہتے ہیں جو اذیت پسند بھی ہیں، اذیت کے مخالف بھی۔ لیکن ان کرداروں میں بھی روح شاعری کی رہتی ہے۔ شاعر کی پہچان گم شدہ نہیں۔ لیکن اس میں کئی پہچانیں چھپی ہوئی ہیں، خود اریب کہتے ہیں:

تم کس سے ملنے آئے ہو
کس چہرے سے کام ہے تم کو
کن آنکھوں سے بات کرو گے
تم جو چہرہ دیکھ رہے ہو
اس میں ہیں کتنے ہی چہرے
جن کو لگائے میں پھرتا ہوں

تم کس سے ملنا چاہو گے؟ (تم کس سے ملنے آئے ہو)

انسان کو اگر مرکزِ کائنات سمجھ لیا جائے تو کائنات ایک ایسی بھیڑ کا نام ہے جس میں انسان کے فکر وخیالات کرب وانبساط کی کارفرمائی ہے۔ ہمارے مفروضات جنھیں ہم اعتقاد کا نام دیتے ہیں۔ مثبت نگاہ میں ایک ایسے مثالی کردار کی تشکیل کرتے ہیں جو کائنات کی بقاء کو مستحکم کرے۔ اگر ہم فلسفیانہ انداز میں یا بہ صورتِ دیگر واضح طور پر ان مفروضات کا اعلان نہ کریں تب بھی ہمارے اذہان اپنے پس منظر میں اس مثالی کردار کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ سلیمان اریب چوں کہ کوئی اخلاقی مصلح نہیں تھے اس لیے ان کو ان بنیادی مفروضات کا اعلان کرنے میں دل چسپی نہیں تھی۔ وہ ایک منفرد فن کار کی حیثیت سے ان حالات سے متاثر ہوتے ہیں جو اس مثالی کردار پر تیشہ زنی کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا لاشعوری ارتعاش ہے جو فن کو ایک خاص زاویے میں پیش کرتا ہے۔

یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ سلیمان اریب کا سماج وادی تحریکات اور ترقی پسندی سے جو ابتدائی تعلق تھا وہ بے بنیاد مفروضہ رہبری اور مقصدیت کے منصوبے سے پاک ہو کر خالص انسانی ہو گیا تھا۔ کسی تحریک سے تعلق بہ ذاتِ خود قابلِ تنقیص نہیں ہوتا۔ بلکہ اس تعلق سے جو عملی تجربہ حاصل ہوتا ہے وہ فن کے نکھارنے میں کارآمد ہوسکتا ہے۔ لیکن فن اور فلسفے کو تحریک کا آرگن بنا کر پیش کرنا نامناسب ہے۔ ادب کا مقصد انسانی درد کا اظہار ہے۔ مگر انسانیت اخلاقیات اور سماجی انصاف کا بالراست سبق دینا ادب کو زیبا نہیں۔ سلیمان اریب کی آخری نظمیں ان کے فکری ٹھہراؤ اور ذہنی نشاۃ ثانیہ کی اچھی مثالیں ہیں۔ بہر حال وطن ہر فرد کا مامن ہوتا ہے کیوں کہ اس کے ذرے ذرے سے انسان اپنا تعلق قائم رکھتا ہے۔ وطن ہی بار بار امتحان بھی لیتا ہے۔ اس اختلاف کو سلیمان اریب بڑی خوب صورتی سے پیش کرتے تھے۔ مثلاً:

حیدرآباد ہی کا ذکر کرو
حیدرآباد ہے وطن میرا
حیدرآباد میرا گلشن ہے

....

حیدرآباد کا نہ ذکر کرو

حیدرآباد میرا مقتل ہے

حیدرآباد سب کا مدفن ہے۔۔(میرا وطن)

حقیقت پسند نگاہ کچھ زیادہ ہی ظالم ہوتی ہے اور تعلقات اور بنیادی نظریات میں عجیب سی سختی پیدا کرتی ہے۔اپنی ماں کی موت پر سلیمان اریب نے کس خوب صورتی سے کہا ہے:

ستّر سال بہت ہوتے ہیں

کون جیئے ،ستّر صدیوں تک

اپنے ہی کاندھوں پہ اٹھائے

اپنا لاشہ

کون پھرے ستّر لمحوں تک

ستّر سال بہت ہوتے ہیں !

سلیمان اریب کی شاعری ایک مکالمہ ہے ۔ایک ایسا مکالمہ جس میں شاعر اپنے مخاطب سے بالراست تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس مکالمے میں خود کلامی کا انداز اور اظہار کا جذبہ دونوں شریک ہیں۔اکثر نظموں میں ایک یا ایک سے زیادہ کلیدی جملے ہوتے ہیں جس پر نظم کی اساس ہوتی ہے۔یہ کلیدی جملے تیزابی اور تند ہوتے ہیں۔مثلاً:

شراب پی کے یہ احساس مجھ کو ہوتا ہے

کہ جیسے میں ہی زمانے میں ایک قاتل ہوں

کچھ بھی نہیں اب زیست کا مقصد

کتوں کی خاطر جیتا ہوں

یہ تو میں خود ہوں وہ احمق، جس کی

اپنی رسوائی میں تسکینِ انا ہوتی ہے

اسی طرح غزلوں میں بھی یکساں ماحول اور یکساں غنائیت ملتی ہے۔ایک خالص کیفیت کے تحت ایک غزل صورت پذیر ہوتی ہے۔اس کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شاعر نے غزل کہنے سے پہلے ایک یا دو اشعار اپنے وجدان سے تخلیق کیے ہوں پھر ان اشعار کی کیفیت

سے متاثر ہوکر یا مرتعش ہوکر غزل مکمل کی ہو۔ اس وجہ سے اریب کی غزلوں میں ایک Prolonged یا طویل احساسی کیفیت ملتی ہے۔ مثلاً :

مٹتی ہوئی دنیا کا سماں دیکھ رہا ہوں　　　بیگانہ وش ونوحہ کناں دیکھ رہا ہوں

اس غزل کا ہر شعر اسی اندوہ میں مبتلا ہے۔ یہی انداز آپ غالب کے پاس بھی پائیں گے۔ غالبؔ کی اکثر غزلیں یکساں رجحان کی جداگانہ طور پر آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اریبؔ کی غزلیں غنائیہ ہیں، عجیب سی بات ہے کہ جس شاعر کی نظمیں نثری اور پُرمواد ہوں، اس کی غزلیں اس قدر غنائیہ ہوں اس رویے کے باوجود یہ غزلیں ذاتی تجربے کے سروا سے سرشار ہیں۔ اندازِ بیان کی تشنگی اور لفظیات کی سادگی کے باوجود معانی کا ایسا رچاؤ ہے کہ اشعار دل میں جگہ لے لیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک خصوصی تنظیم ہے۔ پہلے دو اشعار غنائیہ اور لوچ دار ہوتے ہیں اور پھر کیفیت کے ارتکاز میں مقطع تک ترقی ہوتی جاتی ہے۔ یہ غزلیں دو مختلف رجحانات میں توازن پیدا کرنے کی کوشش بلکہ کشمکش میں ہیں ایک طرف کلاسیک کی خواب گوں اور خوش اسلوب روح ہے تو دوسری جانب نئی کرب ناک زندگی کا آتش فشاں، اریبؔ دونوں مسالک کو نبھانے میں محو تھے، نہ ہی کلاسیک کی دلکشی سے منھ پھیرنا چاہتے تھے اور نہ ہی نئی آواز سے پہلو تہی۔ ان کی غزلیں ان کی ذات سے بھی آلودہ ہیں اور تمناؤں سے بھی۔

رات کا کرب سمیٹے ہوئے اپنے دل میں　　　جھلملاتا ہے کہیں دور، چراغِ سحری

اریبؔ کی غزلوں میں ایک قسم کی شکستگی ملتی ہے۔ وہ کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح ہیں جس نے ماضی کی وادیوں میں سرخروی اور بہادری کے ساتھ جنگ لڑی ہو۔ اور اب اس کے لیے امروز وفردا ۔۔۔۔

دستِ امروز میں کل کی کوئی تحریر نہیں　　　خواب پھر خواب ہے ہر خواب کی تعبیر نہیں
کہاں کی منزل مقصود ، راستہ بھی نہیں　　　سفر میں ساتھ خدا بھی ہے اہرمن بھی ہے
ہزاروں خضر مرے ساتھ ہیں اندھیرے میں　　　بھٹک رہا ہوں کوئی روشنی تو دے مجھ کو

ماضی کے حسین مرغزاروں سے گذرا ہوا یہ سپاہی چیخ سے خاموشی تک پہنچ گیا ہے۔ خوباں کی ثنا خوانی کو کھلے دل سے رنگ و بو نہیں دے سکتا۔ ایک غم ناک انداز میں وہ اپنے ہم سفروں سے کہتا ہے۔

کہاں تک مجھ کو سلجھاتے رہو گے — بہت الجھی ہوئی میں زندگی ہوں
تھکن سے چور، تنہا، سوچ میں گم — میں پچھلی رات کی وہ چاندنی ہوں
مرا یہ حشر بھی ہونا تھا اک دن — کبھی اک چیخ تھا اب خامشی ہوں

اریبؔ کی نظموں اورغزلوں کے لب و لہجے سے یہ بات جھلکتی نظر آتی ہے کہ اکثر تخلیقات نصف شب کے اطراف تشکیل پاتی ہیں۔ خیر یہ تو ایک ذاتی اندازہ ہے۔

☆☆☆

Chandrabhan Khayal by Dr. Ejazuddin Popular Meerty (Meerut)
ڈاکٹر اعجازالدین پاپولر میرٹھی (میرٹھ)

چندر بھان خیالؔ

اردو ادب کی معاصر دنیا میں چندر بھان خیالؔ کا نام نہایت احترام، وقار اور فکری سنجیدگی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ اُن ممتاز ادبی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی شاعری، صحافت، تنقیدی شعور اور تہذیبی وابستگی کے ذریعے اردو زبان و ادب کو نئی توانائی عطا کی۔ چندر بھان خیال صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ایسے دانشور ہیں جنہوں نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب، قومی یکجہتی، انسانی اقدار اور سیکولر فکر کو اپنی تخلیقات کا محور بنایا۔ ان کی پوری ادبی زندگی اردو زبان کی خدمت، اس کے فروغ اور اس کی تہذیبی روح کے تحفظ سے عبارت ہے۔

30 اپریل 1946 کو مدھیہ پردیش کے ضلع ہوشنگ آباد (موجودہ نرمدا پورم) کے قصبہ بابئی میں پیدا ہونے والے چندر بھان خیال کا تعلق ایک سادہ مگر تہذیبی اقدار سے مالا مال ہندو خاندان سے تھا۔ ان کا بچپن معاشی دشواریوں اور محدود وسائل کے درمیان گزرا، مگر علمی و ادبی ذوق نے ابتدائی عمر ہی میں ان کے اندر تخلیقی بیداری پیدا کر دی۔ انہوں نے اردو کسی باقاعدہ استاد سے نہیں سیکھی بلکہ ذاتی شوق، مطالعے اور لگن کے ذریعے اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت میں خود ساختگی، خلوص اور زمین سے جڑی ہوئی سادگی نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

چندر بھان خیال کی شخصیت کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اردو کو کبھی کسی مذہب یا فرقے کی زبان نہیں سمجھا بلکہ اسے ہندوستانی تہذیب کی مشترکہ میراث قرار دیا۔ وہ بارہا اس بات کا اظہار کرتے رہے ہیں کہ اردو ہندوستان کی سب سے زیادہ مقبول اور سیکولر زبان ہے، جس سے ہر مذہب اور ہر طبقے کے لوگ محبت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اردو کی اصل روح محبت، رواداری، تہذیبی ہم آہنگی اور انسانی اخوت میں پوشیدہ ہے۔ یہی نظریہ ان کی

شاعری اور گفتگو دونوں میں پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔

بطور صحافی بھی چندر بھان خیال کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے ''سویرا''، ''تیج'' اور خصوصاً ''قومی آواز'' جیسے اہم اردو اخبارات میں طویل عرصے تک خدمات انجام دیں۔ ان کی صحافت صرف خبروں کی ترسیل تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ صحافت کو ایک سماجی مشن سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ انسان دوستی، سماجی انصاف اور قومی ہم آہنگی کی حمایت کی۔ ان کے اسلوب میں جراتِ اظہار، تہذیبی شائستگی اور فکری توازن نمایاں نظر آتا ہے۔

شاعری کے میدان میں چندر بھان خیال کی شناخت ایک حساس، باوقار اور فکری شاعر کی حیثیت سے قائم ہوئی۔ ان کی شاعری میں جذبات کی شدت بھی ہے اور شعور کی روشنی بھی۔ وہ انسان، سماج، محبت، سیاست، تہذیب اور وقت کے مسائل کو نہایت سادہ مگر اثر انگیز انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں لفظوں کا غیر ضروری شور نہیں بلکہ معنی کی گہرائی اور احساس کی سچائی پائی جاتی ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں ایک ایسا داخلی کرب موجود ہے جو قاری کے دل میں اتر جاتا ہے۔

ان کے متعدد شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں جن میں ''شعلوں کا شجر''، ''گمشدہ آدمی کا انتظار''، ''لولاک''، ''صبحِ مشرق کی اذان'' اور ''تازہ ہوا کی تابشیں'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی طویل نظم ''لولاک'' کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس پر انہیں ایران کی جانب سے اعزاز بھی ملا۔ ان کے شعری مجموعے ''تازہ ہوا کی تابشیں'' پر انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا، جو ان کی ادبی عظمت کا اعتراف ہے۔

چندر بھان خیال کی شاعری کا ایک اہم وصف انسان دوستی ہے۔ وہ مذہبی منافرت، تعصب اور تنگ نظری کے سخت مخالف ہیں۔ ان کی شاعری میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ وہ ایسے شاعر ہیں جو اختلاف کے باوجود محبت کا دامن نہیں چھوڑتے اور امید کا چراغ روشن رکھتے ہیں۔ ان کے کئی اشعار عوامی سطح پر بے حد مقبول ہوئے، جیسے:

جستجو کے پاؤں اب آرام سا پانے لگے   اب ہمارے پاس بھی کچھ راستے آنے لگے

وہ جہاں چاہے چلا جائے یہ اس کا اختیار   سوچنا یہ ہے کہ میں خود کو کہاں لے جاؤں گا

ان اشعار میں داخلی اضطراب، زندگی کا شعور اور انسان کی فکری بے چینی پوری

شدت کے ساتھ موجود ہے۔

چندر بھان خیال کی شخصیت کا ایک اور نمایاں پہلو ان کی تہذیبی شائستگی اور انکساری ہے۔اتنی شہرت،اعزازات اور ادبی مرتبے کے باوجود ان کے اندر غرور یا خود نمائی کا کوئی عنصر نہیں ملتا۔ وہ آج بھی ایک سادہ،مخلص اور محبت کرنے والے انسان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ان کی گفتگو میں دیانت،تحمل اور فکری پختگی نمایاں ہوتی ہے۔

ہندوستان کی ادبی فضا میں چندر بھان خیال کا وجود ایک ایسے روشن چراغ کی مانند ہے جو اردو زبان،قومی یکجہتی اور انسانی قدروں کی روشنی پھیلا تا رہا ہے۔انہوں نے ثابت کیا کہ ادب صرف لفظوں کا کھیل نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت،سماج کی اصلاح اور تہذیب کی حفاظت کا ایک مؤثر ذریعہ بھی ہے۔ اردو ادب ان کی خدمات کو ہمیشہ احترام کے ساتھ یاد رکھے گا اور آنے والی نسلیں انہیں محبت، رواداری اور ادبی وقار کے استعارے کے طور پر دیکھیں گی۔

☆☆☆

Professor Qamar Rais by Mohd. Shahid Pathan (Jaipur)

محمد شاہد پٹھان (جے پور) cell- 9372843907

پروفیسر قمر رئیس

پروفیسر قمر رئیس ماہر پریم چند کے ساتھ ہی ساتھ ایک ترقی پسند نقاد کی حیثیت سے معروف ہیں، وہ اپنی طالب علمی کے دور سے ہی مارکسی نظریات اور ترقی پسند تحریک سے متاثر رہے ہیں، انہوں نے ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے ۱۹۵۹ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنا تحقیقی مقالہ داخل کیا۔ بعد کو پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کے مطالعوں پر ان کی الگ الگ تصانیف شائع ہوئیں۔قمر رئیس اُردو فکشن کے چند معتبر نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ پریم چند کے تحقیقی وتنقیدی مطالعات کے علاوہ انہوں نے دوسرے ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کو بھی موضوعِ مطالعہ بنایا ہے، علاوہ ازیں اُردو ناول کے فنی وتاریخی ارتقاء کا بھی انہوں نے ژرف نگاہی سے جائزہ لیا ہے۔

قمر رئیس کے مطالعات میں ترقی پسند فکشن اور شاعری کو خاص اہمیت حاصل ہے، ان کے بیشتر مضامین ومقالات ترقی پسند ناول نگاروں، افسانہ نگاروں، شاعروں اور نقادوں پر مشتمل ہیں۔انہوں نے اپنے مارکسی اور ترقی پسند نقطۂ نظر سے ادب وشعر کا بالغ نظرانہ مطالعہ کیا ہے، اپنے ادبی نقطۂ نگاہ کی صراحت کرتے ہوئے قمر رئیس رقم طراز ہیں: ''میرے نزدیک ہر ادبی تخلیق، خواہ وہ کسی بھی باطنی تجربے یا داخلی حقیقت کا اظہار ہو اور اس کا پیرایہ بیان کتنا ہی نازک اور تہہ دار ہو، کسی نہ کسی سماجی صورتِ حال کا عکس ہوتی ہے اور صرف عکس ہی نہیں، وہ اس پر تبصرہ بھی ہوتی ہے، اس کی تفسیر بھی اور تنقید بھی، اگر چہ یہاں اس حقیقت کے اعتراف میں مجھے تامل نہیں کہ شعروادب میں سماجی عنصر ایک متحرک انسانی وجود کے واسطے سے اس کی منفرد شخصیت اور مخصوص طبعی میلانات کا جزو بن کر اور فنی تخلیق کے مراحل سے گزر کر سامنے آتا ہے، اس لیے ادب کے مطالعے میں سماجی اور تاریخی عوامل کے ساتھ ساتھ فن کار کی شخصیت کے

تشکیلی عناصر، اور داخلی محرکات کا مطالعہ بھی اہمیت رکھتا ہے، دوسرا پہلو جو ادب کے مطالعے میں ہمیشہ میرے پیشِ نظر رہا ہے، فن وادب کی روایات، ان کا تسلسل اور ان کے مخصوص ضابطے ہیں، سماجی نظام اور سماجی اقدار کی تبدیلی اور اس تبدیلی کے قوانین ادب کے اقدار، معیار اور اس کے قوانین کو اسی رفتار سے اور اسی حد تک بدلتے ہیں جس طرح اور جس حد تک وہ انسانی اقدار انسانی جذبات اور محسوسات کے مجموعی اور عمومی Pattern پر اثر انداز ہوتے ہیں...... کہنے کا مدعا یہ ہے کہ ادب کے مطالعے میں ان تینوں پہلوؤں پر نظر رکھنا، ان کے امکانات، حدود، باہمی روابط اور گوناگوں اثرات کو سنجیدہ انہماک سے سمجھنا اور سمجھانا تنقید کا ایسا منصب ہے جو اسے علمی وزن و وقار بخشتا ہے۔'' (تلاش وتوازن، ص:۹، ڈاکٹر قمر رئیس، اشاعت: ۱۹۶۸ء ادارۂ خرام پبلی کیشنز دہلی)۔

غرض کہ قمر رئیس ادب وشعر کو سماجی حقائق وآثار کا ترجمان سمجھنے کے ساتھ ہی ساتھ اسے فن کار کی شخصیت وداخلیت کا انعکاس بھی گردانتے ہیں اور ساتھ ہی وہ ادبی وفنی روایات واقدار اور فنی وسائل کی اہمیت کے بھی قائل ہیں۔ یہ تصورِ ادب دراصل امتزاجی اور سائنٹفک تصورِ نقد ہے، جس میں نظریاتی ادعائیت کو دخل نہیں ہے، اُردو میں ۶۵۔۱۹۶۰ء کے بعد یعنی کہ جدیدیت کے بروئے کار آنے کے ساتھ ہی مارکسی تنقید میں یہ خوش گوار تبدیلی آئی کہ اس نقطۂ نظر کے حامل ناقدین اپنے مطالعات میں سماجی تناظرات کے ساتھ ہی ساتھ تخلیق کار کی انفرادیت اور فن کے اسلوب وآہنگ کی اہمیت کا اعتراف بھی کرنے لگے۔ یہ ذہنی وفکری تبدیلی ترقی پسند ناقدین اور شعرائے کرام دونوں کے ادبی معمولات ومظاہر میں رونما ہوئی ہے، چنانچہ قمر رئیس نے حسن عابد (پاکستان) کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:''اس شعری مجموعے (کربِ آسودگی) میں، میں نے اس 'نئی ترقی پسندی' کی بوطیقا کے خط وخال دیکھے ہیں جس کی تشکیل ہندو پاک میں ۷۰ء کے بعد کی شاعری میں ہو رہی ہے۔ یہ سفر کی دوسری منزل ہے۔'' (تعبیر وتحلیل، ص:۲۶۲، پروفیسر قمر رئیس، اشاعت ۱۹۹۶ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی)

دراصل ترقی پسند تحریک کے شروعاتی دور میں جو نظریاتی ادعائیت وانتہا پسندی رونما ہوئی تھی وہ آزادی کے بعد اور خاص کر ''جدیدیت'' کے اثرات کے بعد بتدریج کم ہوتی گئی،

چنانچہ چھٹی دہائی میں منظر عام پر آنے والے تخلیق کاروں اور ناقدین حضرات کے یہاں یہی'' نئی ترقی پسندی'' بروئے عمل آئی ہے۔قمر رئیس نے سردار جعفری کی کتاب'' ترقی پسند ادب'' (۱۹۵۱ء) کے متعلق لکھا ہے کہ:'' پینتالیس سال قبل لکھی ہوئی اس کتاب میں آج اگر گہرائی کی کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ آج مارکسی تنقید میں زیادہ دقتِ نظر اور حکیمانہ بصیرت پیدا ہوگئی ہے، مارکسی تنقید اب بڑی حد تک مارکسی تصورات کے یک رُخے میکانیکی اطلاق سے آزاد ہوگئی ہے، اب گورکی پلیخا نوف، کورکی لوکاچ، اور برطول بریخت کی کم وبیش ساری تحریریں انگریزی میں دستیاب ہوجاتی ہیں۔ان کے علاوہ وی۔جے۔جیرام اڈالف سانکیز واز کویز، ڈیوڈ کریگ، گراچی اور وکٹر کیرتن جیسے مارکسی دانشوروں کی کتابیں بھی مل جاتی ہیں جو عالمی اور قومی سطح پر ادب اور تہذیب کے مسائل کی تفہیم میں ایک نئی فلسفیانہ اور تخلیقی بصیرت عطا کرتی ہیں، جس کے شواہد نوجوان نقادوں محمد علی صدیقی، اصغر علی انجینئر، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر ش۔اختر، عتیق احمد، اشفاق حسین، علی احمد فاطمی اور دوسروں کے یہاں دیکھے جاسکتے ہیں، خود جعفری کے شعور اور تنقیدی رویوں میں گزشتہ بیس برسوں میں نتیجہ خیز اور خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوئیں ہیں۔'' (تعبیر وتحلیل، ص:۲۸۸)

''مارکسزم'' کا گہرائی اور کشادہ نظری سے مطالعہ کرنے والے ادبا وناقدین کے یہاں ہی درحقیقت تخلیق وتنقید کا جامع اور سائنٹفک تصور ملتا ہے۔عزیز احمد، اختر انصاری، آل احمد سرور، احتشام حسین، محمد علی صدیقی، ممتاز حسین اور محمد حسن وغیرہ ایسے سینئر نقاد ہیں جن کے یہاں ادب فہمی کا جامع طریقِ کار نمایاں ہے۔قمر رئیس کے یہاں بھی ادب ونقد کا مؤقر نقطۂ نظر ہویدا ہے، اپنے تنقیدی نقطۂ نگاہ کی صراحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:'' یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ میں اپنے ادبی موقف اور تنقیدی تفہیم میں مارکسزم سے روشنی حاصل کرتا ہوں، مارکسزم میرے نزدیک کوئی عقیدہ یا بے لچک میکانکی نظریہ نہیں بلکہ زندگی، تاریخ، معاشرہ اور انسانی کلچر کے مظاہر کی تفہیم وتعبیر کا ایک کشادہ سائنسی طریقِ کار (Method) ہے، جس سے کم وبیش گذشتہ سو سال کے عرصہ میں ادب کے محرکات، ماخذوں اور ادبی سرمایہ کی تفہیم وتجزیہ میں مؤثر اور کارگر طور پر کام لیا گیا ہے، اس مدت میں کتنے ہی دوسرے نظریات، علم ودانش کی دنیا میں متعارف ہوئے، تخلیقی سرگرمیوں اور تنقیدی رویوں پر وہ اثر انداز بھی ہوئے لیکن ایک

قلیل مدت میں ان کی آب وتاب ہی نہیں معنویت بھی معدوم ہوگئی، جبکہ مارکسی تنقید کی روایت بعض انتہا پسندانہ اورادعائی وقفوں کے باوجود جاری رہی، زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ ہی ساتھ اس میں زیادہ وسعت، گہرائی اورتہہ داری پیدا ہوتی گئی، یہی نہیں مارکسی فکر کے معروضی اورعقلی طریقِ کار نے دوسرے نظریوں کوموضوعیت، جارحیت اور عدم توازن پر مؤثر روک لگائی اور اس طرح ادب کے مطالعے میں علمی افہام وتفہیم اوراعتدال کی راہ ہموار کی۔''

(تعبیر وتحلیل،ص:۱۰)

محولہ بیان کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ قمر رئیس کے نزدیک مارکسی یا''نئی ترقی پسند تنقید'' ہی بہتر اور مؤثر طریقِ کار ہے جس کے ذریعے ادب وشعر کا معقول وسنجیدہ مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔یہی سبب ہے کہ مغرب میں ظہور پذیر جدید ترین تنقیدی رجحانات مثلاً ساختیات، پس ساختیات کے علم بردار مفکرین بھی بہرطور''مارکسزم'' سے مستفیض ہیں حتیٰ کہ ردِتشکیل کا بانی دریدہ بھی مارکسی فکر کے اثر سے آزاد نہیں جیسا کہ اس نے ایک انٹرویو میں اعتراف کیا ہے،اس نے کہا کہ وہ آزاداورکشادہ مارکسزم میں دلچسپی رکھتا ہے۔'' (تعبیر وتحلیل،ص:۱۱)

اُردو کے افسانوی شعری ادب کے مطالعے کے ساتھ ہی ڈاکٹر قمر رئیس نے''لوک ادب'' کی تدوین اور تفہیم پر بھی زوردیا ہے،انہوں نے اس امر پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ اُردو میں''لوک ادب'' پر دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت ہی کم کام ہوا ہے اور ہمارے بیشتر محققین ونا قدین نے اس طرف توجہ نہیں دی ہے۔قمر رئیس کے ادبی وتنقیدی نقطۂ نظر میں چونکہ اجتماعیت وسماجیت کو خاص اہمیت حاصل ہے، اس لیے عوامی اور لوک ادب سے انہیں فطری لگاؤ ہے کہ:''یہ گیت زیادہ تر اجتماعی اور کم تر انفرادی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں، اکثر یہ گیت محنت کش عوام کی اجتماعی تخلیقی محنت کے عمل میں خلق ہوتے ہیں اور گائے جاتے ہیں۔ان کا آہنگ کسی عروضی قاعدے کے بجائے،عوام کے احساس موسیقی کا تابع ہوتا ہے۔عوامی قصوں کے ماخذ بھی یا تو عوام کے تلخ وشیریں تجربات ہوتے ہیں یا پھر مصائب حیات سے نجات پانے کی ازلی خواہش اور ایک بہتر زندگی کے خواب ہوتے ہیں۔''

(اُردو میں لوک ادب،ص:۶ رمرتب قمر رئیس، اشاعت ۲۰۰۳ء، کتابی دنیا، دہلی)۔

چنانچہ قمر رئیس نے اپنے مضمون میں اُردو میں لوگ گیت کی روایت اوران کی اہمیت

ومعنویت پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے، اُردو والوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی سعی کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مزید لکھا ہے: ''دوسری زبانوں میں لوک ادب کی تحقیق کی طرف توجہ دینے کا خاص سبب یہ ہے کہ وہ ملک میں جمہوری نظام کی استواری کے ساتھ ساتھ عوامی کلچر اور لوک روایات کے احیاء کی ضرورت کو سمجھتے اور اس صورتِ حال سے ذہنی ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ اُردو والے شاید اس جمہوری بیداری اور جمہوری کلچر کی تجدید کا احساس ہی نہیں رکھتے۔''

(اُردو میں لوک ادب، ص: ۱۴ رمرتب قمر رئیس)

ادب وشعر کے اس وسیع، جامع، جمہوری اور عوامی وآفاقی تصور کے پیش نظر قمر رئیس نے اُردو کے افسانوی اور شعری ادب کے علاوہ روسی واُزبکی ادب کو بھی موضوع مطالعہ بنایا ہے۔ ان کا یہ سلسلۂ مطالعہ ساتویں دہائی سے لیکر اکیسویں صدی کے عشرۂ اوّل تک پھیلا ہوا ہے۔ قمر رئیس نے ازبکی جدید شاعری کے اُردو میں ترجمے بھی کئے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے اس ضمن میں ان کا ایک اہم مضمون'' جدید ازبکی شاعری'' لائقِ مطالعہ ہے، جسے مصنف ۱۹۶۵ء میں اپنے تاشقند کے قیام کے دوران لکھنا شروع کیا۔''

(تلاش وتوازن، ص: ۱۱، اشاعت ۱۹۶۸ء، جمال پریس، دہلی)

ہمارے خیال سے مضمونِ مذکور قمر رئیس کی عملی تنقید کا ایک کامیاب نمونہ ہے، یہ واقعتا مطالعے سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح فکشن تنقید کے تعلق سے'' جدید اُردو ناول''، ''تشکیل سے تکمیل تک''، ''پریم چند کی کہانیوں کا مطالعہ''، ''پریم چند کی روایت اور جدید افسانوی ادب'' اور ''معاصر افسانے کا منظر اور پس منظر'' وغیرہ مضامین بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں، پریم چند پر ان کا تحقیقی وتنقیدی کام واقعتاً قابلِ قدر بھی ہے اور لائق تقلید بھی، قمر رئیس کو اس امر کا احساس ہے کہ: ''ادب کی بعض اصناف ایسی ہیں (مثلاً ناول) جن میں سماجی حقائق اور اُن کے بارے میں مصنف کے نقطۂ نگاہ کا مطالعہ نسبتہً آسانی اور وضاحت سے ممکن ہے اور بعض اصناف (مثلاً شاعری) ایسی ہیں جن میں مصنف کا طرزِ ادراک واحساس اس کی شخصیت کی تہوں، تجربہ اور تخیل کو نو بہ نو کیفیتوں اور رموز وعلائم کی نزاکتوں اور ندرتوں میں پنہاں ہوتا ہے، تنقید ان رجحانات کے حسن کو سمجھتی اور سراہتی، کائنات سے اس کے رشتوں کی توضیح کرتی، اور اس کے فن کی انفرادیت اور معنویت کو دریافت کرتی ہے۔ میں نے اپنے مطالعوں میں اسی مطمحِ نظر کو

سامنے رکھا ہے۔'' (تلاش وتوازن:ص:۱۰)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قمر رئیس کے بیشتر مطالعات ناول اور افسانے کی تنقید پر مشتمل ہیں مگر ساتھ ہی انہوں نے حالیؔ سے لیکر احمد فرازؔ اور دوسرے ترقی پسند اور جدید شعرأ پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان کے مطالعے میں انہوں نے بڑی حد تک متوازن انداز نقد اختیار کیا ہے، علاوہ ازیں انہوں نے کئی شعرأ کے شعری مجموعوں پر مقدمے اور دیباچے بھی لکھے ہیں، جن میں ان کا صالح ترقی پسندانہ اور وسیع لسانی نقطۂ نظر بروئے کار آیا ہے، قمر رئیس کی شعری تنقیدی میں حالیؔ، اُردو کے لوک گیت، جوشؔ، فیضؔ، اختر الایمانؔ، کیفی اعظمیؔ، احمد فرازؔ، عزیز قیسی، حسن عابدؔ اور بعض دوسرے ہم عصر شعرأ کے مطالعات شامل ہیں۔ قمر رئیس کی تنقیدی تصانیف میں '' پریم چند کا تنقیدی مطالعہ (بحیثیت ناول نگار) (۱۹۶۳ء) '' تلاش و توازن'' (۱۹۶۸ء) ''تنقیدی تناظر'' (۱۹۷۸ء) ''تعبیر وتحلیل'' (۱۹۹۶ء) ''اردو میں بیسوی صدی میں افسانوی ادب''، ''بیسویں صدی میں اُردو شاعری'' (زیر اشاعت) اور ''محمد ظہیر الدین بابر'' وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں قمر رئیس کی عملی تنقیدوں سے کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے ان کے طریقِ نقد کا اندازہ ہو سکے گا۔

پریم چند کے ناولوں کے عوامی وسماجی تناظرات اور سروکاروں کی نشاندہی کرتے ہوئے قمر رئیس رقم طراز ہیں: ''پریم چند کے ناول اپنے عہد کے ان ہمہ گیر اور نو بہ نو تغیرات کی تاریخ ہیں، وہ اس عہد کی سماجی گھٹن، سیاسی اضطراب اور اقتصادی بدحالی کی جیتی جاگتی تصویر ہیں، پریم چند پہلے عوامی فن کار ہیں جنہوں نے اُردو ادب کو سماجی حقیقت نگاری سے روشناس کرایا، انہوں نے شعوری طور پر اپنے عہد کی زندگی کے بنیادی مسائل تک رسائی حاصل کی۔''

(پریم چند کا تنقیدی مطالعہ، ص: ۹۰، اشاعت ۱۹۶۳ء، ناشر: سرسید بک ڈپو، علی گڑھ)

پریم چند کے افسانوں کی تکنیکی وفنی خصوصیات بتاتے ہوئے قمر رئیس لکھتے ہیں: '' جہاں تک افسانہ کی تکنیک کا تعلق ہے پریم چند نے ایک طرف ہندوستان کے قدیم قصوں اور لوک کہانیوں اور دوسری طرف مغرب کے طرزِ جدید کے افسانوں، دونوں سے فیض اُٹھایا ہے، وحدت تاثر کو وہ مختصر افسانہ کی جان سمجھتے ہیں، اور اس پر زور دیتے ہیں کہ افسانہ میں ایک لفظ اور ایک فقرہ بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو اس کے مرکزی خیال کو واضح نہ کرتا ہو اس کے ساتھ ہی

انہیں اس کا بھی لحاظ ہے کہ افسانہ کی زبان اور پیرائیہ بیان سادہ، عام فہم اور افسانہ کے بنیادی خیال کے مطابق ہونا چاہیے۔'' (تعبیر و تحلیل، ص: ۷۴)

اسی طرح پریم چند کے افسانوں کے موضوعات و مسائل سے بحث کرتے ہوئے قمر رئیس لکھتے ہیں: ''پریم چند سے پہلے اُردو کا افسانوی ادب شہری زندگی اور اس کے مسائل تک محدود تھا، پریم چند نے پہلی بار اُردو افسانہ میں گاؤں کی کھلی ہوئی زندگی، اس کے میلے ٹھیلے، کھیت اور کھلیان، چوپال اور گاؤں کے سماجی رشتوں کو پیش کیا، ان کے پہلے حقیقت پسندانہ افسانہ'' بے غرض محسن'' (ستمبر ۱۹۱۰ء) کا ہیرو ایک معمولی غریب کسان ہے، اس کے بعد'' خونِ سفید''، ''صرف ایک آواز'' اور'' اندھیرا'' جیسی کہانیوں میں انہوں نے گاؤں کے نچلے طبقے کی زندگی اس کی مفلوک الحال، محرومیوں اور مجبوریوں کی روداد موئثر ڈھنگ سے بیان کی ہے،'' صرف ایک آواز'' میں انہوں نیا چھوتوں کی المناک زندگی اور اس کے بارے میں ہندو سماج کی بے حسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے،'' اندھیرا'' میں پولیس اور عمّالِ حکومت کے ہاتھوں سیدھے سادے کسانوں کی لوٹ کھسوٹ کا قصہ سنایا ہے،'' خونِ سفید'' میں بھی گاؤں کے ہندو سماج میں چھوت چھات کی رسم پر بڑا بھرپور وار کیا ہے۔......الغرض ملک کے اجتماعی مسائل ہوں یا گھریلو اور انفرادی، پریم چند ایک واضح ترقی پسند نقطۂ نگاہ رکھتے تھے، وہ گاؤں میں پلے بڑھے تھے، اور ہندو سماج سے تعلق رکھتے تھے اس لیے فطری طور پر ابتدا میں ان کی توجہ کا مرکز یہی سماج تھا، آریہ سماجی خیالات اس دور میں ان کی سماجی فکر پر اثر انداز ہوئے لیکن جیسے جیسے ان کے تجربات اور مشاہدات کا دائرہ وسیع ہوا اور وہ ملک کی قومی اور عوامی تحریکوں کے قریب آتے گئے ان کے سماجی شعور میں بھی وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی اور اسی نسبت سے ان کے افسانوں میں بھی تنوع کے ساتھ ساتھ تہہ داری، وسعتِ نظر اور فنی تکمیل کے عناصر کا اضافہ ہوا۔'' (تعبیر و تحلیل، ص: ۸۰-۷۹)

پریم چند کے علاوہ قمر رئیس کے پسندیدہ افسانہ نگاروں میں بیدی سرفہرست ہیں اور اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ بیدی کے افسانوں میں بھی ہندوستان کے ارضی و عوامی مسائل و مصائب کی عکاسی فن کارانہ انداز میں ملتی ہے، لہٰذا قمر رئیس نے بیدی کے افسانوی فکر و فن کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''بیدی کا ادبی ورثہ اس لیے اہم ہے کہ وہ ان کے سنجیدہ اور دردمندانہ غور وفکر کا آئینہ دار ہے، ان کی ہر تخلیق شعوری، یا غیر شعوری طور پر ان کے عہد کے انسانی مسائل اور معاشرتی صورتِ حال کا عکس ہوتی ہے، لیکن ان کے ادبی ورثہ کی تیسری جہت یعنی فنی اور جمالیاتی تکمیل مذکورہ دو پہلوؤں سے کسی طرح کم اہمیت کی حامل نہیں ہے، دراصل یہی وہ گوشہ ہے جس میں انہیں اپنی منفرد تخیلی صلاحیت اور تخلیقی ذہانت کو آزمانے کا موقع ملا اور جس نے ابتدا ہی سے اپنے معاصرین میں انہیں اپنی شناخت قائم کرنے کا امتیاز بخشا...... بیدی کے بعض معاصرین جو عوامی زندگی کی ترجمانی کا دعوا کرتے تھے دراصل عوام کے دکھ درد سے اتنا قریب نہیں تھے، جتنا کہ بیدی...... یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ پریم چند کے بعد جس ادیب نے ہندوستان کے کروڑوں افسانوں کے دکھوں اور محرومیوں کو فن کی مؤثر زبان عطا کی، جس نے متوسط طبقے کی بورژوا اخلاقیات کو بے نقاب کیا وہ بیدیؔ ہیں۔ ناداروں، مظلوموں اور سماج کے دبے کچلے انسانوں سے گہری اور راست وابستگی کا جو احساس پریم چند کے یہاں ملتا ہے وہی بیدی کے آرٹ کا امتیازی وصف ہے، وہ ایسا دردمند اور حساس دل رکھتے تھے کہ اگر چاہتے بھی تو انسانوں سے یگانگت کے اس رشتے کو توڑ نہ پاتے۔'' (تعبیر وتحلیل، ص:۱۰۷)

اسی طرح اپندر ناتھ اشکؔ اور جوگندر پال کے افسانوں کا بھی قمر رئیس نے رسا کارانہ جائزہ لیا ہے، جوگندر پال کے افسانوں کے فنی اسلوب کی تحسین کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''جوگندر پال کی کہانی اپنی تکنیک میں منفرد اور اچھوتی ہیں اور اب تو یہ انفرادیت رچ بس کر اتنی روشن ہوگئی ہے کہ کہانی خود بول اٹھتی ہے کہ ''میں پال کی مخلوق ہوں، اس کی شناخت کا خاص اسلوب ایک خاص طرح کی ہم کلامی ہے، کبھی وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے (بے محاورہ) اور اپنے وجود کے حوالے سے زندگی کی گہری سچائیوں سے آنکھیں چار کرتا ہے، کبھی کسی حاملہ ہرنی سے باتیں کرتا ہے (ہرامبے) اور حیوان کے سہارے انسان کو ازلی دکھوں کی بپتا سناتا ہے...... یہ ساری کہانیاں بیانیہ کا ایک نکھرا ہوا روپ ہیں، جو عصر حاضر کی پیچیدہ حقیقتوں کو نسبتہً سلجھا کر بیان کرتی ہیں، ان سب کے پیچھے جو ہمہ داں راوی ہے وہ خود جوگندر پال ہے جو کہانی میں دکھائی نہیں دیتا لیکن اس کی دردمندی اور ذہانت کہانی کے ہر لفظ

میں جگنو کی طرح چمکتی ہے، ان کہانیوں میں فنطاسیہ اور واقعیت پسندی کا ایسا امتزاج ہے جو غیر معمولی تخلیقی حسن کی نشان دہی کرتا ہے، نئی کہانی میں بعض دوسرے تخلیق کاروں نے بھی اس انداز کو برتا ہے لیکن ان کا تانا بانا اکثر ڈھیلا اور بے رنگ ہو جاتا ہے، جوگندر پال کے یہاں بے ساختگی اور شگفتہ بیانی ایک مرقع سجا دیتی ہے۔'' (تعبیر و تحلیل، ص: ۱۳۳)

جوش ملیح آبادی کی غزل بیزاری اور ان کے فارسی آمیز اسلوب و آہنگ کی تاویل بیان کرتے ہوئے قمر رئیس نے معنی خیز بحث کی ہے وہ لکھتے ہیں: ''جوش کے عہد طفولیت تک اُردو شاعری پر غزل کی حکمرانی تھی اور غزل کی شاعری بنیادی طور پر انفعالی جذبات لطیف واردات اور نرم و نازک کیفیات کی شاعری تھی...... جوش اُردو شاعری کو غزل کی انفعالیت اور نسوانیت کے طلسم سے آزاد کرانا چاہتے تھے، اس لیے انہوں نے غزل سے بغاوت کر کے اُردو شاعری کو مردانہ وقار اور صلابتِ اظہار کے نئے ذائقے سے آشنا کیا جس کے اثرات بیسویں صدی کی نظمیہ شاعری پر آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔'' (تعبیر و تحلیل، ص: ۱۵۸)

''جوش کی شعریات کا ایک امتیازی پہلو شعر کی داخلی اور خارجی ہیئت کی آراستگی کا تصور ہے جسے مشرقی شعریات میں شعر کے محاسن میں شمار کیا گیا ہے، داخلی ہیئت کی آراستگی الفاظ کے انتخاب، دروبست، صوتی مناسبت اور مترادفات وغیرہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جوش کی شعری لفظیات میں ابتدا ہی سے آرائش کا عنصر غالب رہا ہے، وہ صوتی اعتبار سے نرم و گداز اور سادہ الفاظ کے بجائے پُر آہنگ، پُرجلال اور پُرزور الفاظ کے استعمال کو ترجیح دیتے ہیں، ان کی شاعری کا آہنگ فارسی سے بہت قریب رہا ہے۔ وہ شعر میں فارسی کی خوبصورت بندشیں ترکیبیں، شعری اظہارات ایسی بے تکلفی اور برجستگی سے استعمال کرتے ہیں کہ آورد یا تصنع کا احساس نہیں ہوتا۔ غالب کے علاوہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے فارسی لفظیات سے ایسی فراخدلی اور فن کاری سے فائدہ اُٹھایا ہو، جس طرح جوش نے اُٹھایا ہے، جوش نے یہ جو الگ راہ نکالی ہے اس میں کچھ تو دبستانِ ناسخ کا فیضان تھا لیکن اس سے زیادہ یہ حالی کے نظریۂ شاعری کا ردعمل تھا۔'' (تعبیر و تحلیل، ص: ۱۶۲)

فیض کی شاعری کے فکری و فنی عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے قمر رئیس نے صحیح لکھا ہے کہ: ''فیض نے اپنی مجاہدانہ شاعری کے لیے بھی غزل کا انتخاب کیا اور اس کے

توسط سے اپنے تجربات کوعوام کے وسیع تر حلقوں تک پہنچایا جس طرح بریخت نے اپنے عوام پسند ڈراموں کے ذریعے سرمایہ داری اورابھرتی ہوئی فاشسٹ طاقتوں کی جارحیت کے خلاف عوام کو باشعور بنایا اسی طرح فیض نے اپنی مقبولِ عام شاعری سے سرمایہ دارانہ اور سامراجی طاقتوں کی سازشوں کو بے نقاب کیا ہے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ فیض نے جہاں غزل کی کلاسیکی علامات او امیجری کو قائم رکھا ہے وہیں نظم میں انہوں نے نئے اشعاروں کے ذریعے پیکر تراشی سے کام لیا اورنئی ہئیتوں کو برتا ہے، وہ قومی اور عالمی صورتِ حال کے جس المیہ رخ اور جس انقلابی شعور کوعوامی بیداری کا حصہ بنانا چاہتے تھے اس کے لیے غزل میں مقبول عام کلاسیکی علامات ہی کارگر ثابت ہوسکتی تھیں اور ہوئیں، جبکہ نظم میں اس عام پسند غزلیہ یا غنائی لہجہ کوقائم رکھتے ہوئے انہوں نے نئے اورزیادہ تہہ دار پیکروں کوکامیابی سے برتا۔'' (تعبیروتحلیل،ص:۲۰۳)

کیفیؔ اعظمی کی شاعری کے مزاج ومنہاج پر روشنی ڈالتے ہوئے قمر رئیس ان کے باغیانہ آہنگ کی معنویت کچھ اس طرح ظاہر کرتے ہیں:''ہر باغی نوجوان کی طرح کیفی بھی رومانی مزاج لیکر پیدا ہوئے تھے لیکن یہ رومانیت وہ نہیں تھی جو زندگی کے معروضی حقائق سے منہ موڑ کر ذات کے خول میں قید کر دیتی ہے اورفن کا روجود کے اسرار یا پھر مرگ وحیات کے مسائل پر سوچ وچار کرنے میں عمر عزیز برباد کرتے ہیں یہ ایسی فعال اور متحرک رومانیت ہے جو بقول گورکی زندہ رہنے کی انسان کی خواہش کو استحکام بخشتی ،اوراسے ماحول کی پستیوں سے اونچا اُٹھاتی ہے،کیفیؔ اعظمی نے گذشتہ چالیس سال میں جوشاعری کی ہے وہ اسی متحرک رومانیت اور باغی احساس وفکر کی شاعری ہے۔'' (تعبیروتحلیل،ص:۲۲۵)

احمد فرازؔ تخلیقی اورنظریاتی سطح پر فیضؔ سے متاثر رہے مگر وہ اپنا منفرد شعری آہنگ بنانے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں،غزل اورنظم دونوں میں ان کے ترقی پسندانہ احساسات وافکار اپنی آفاقی واجتماعی کیفیت میں بروئے کار آئے ہیں۔قمر رئیس؛احمد فراز کی نظمیہ شاعری کے زیادہ قائل ہیں لکھتے ہیں:''احمد فرازؔ نے غزل کے اشاراتی امکانات سے پورا فائدہ اُٹھایا ہے اوراسے روح عصر سے ہم کنار کیا ہے،نظم میں ان کا یہ طرزِعمل زیادہ تخیلی وسعت اورفکری نیرنگی کا آئینہ دار ہے۔''(تعبیروتحلیل،ص:۲۴۲)

احمد فرازؔ کی موضوعاتی وسعت وہمہ گیریت اوران کے تخلیقی سروکاروں کا احاطہ کرتے ہوئے قمر رئیس رقم طراز ہیں: ''احمد فراز کی آگہی اور ذہانت اپنے عہد کے نت نئے تقاضوں سے پوری طرح باخبر رہی ہے، انھوں نے ظلم وجبر اور استحصال کی سفاک طاقتوں کے مقابلے میں اپنے وطن کے اور ساری دنیا کے دبے کچلے انسانوں کی طرف داری کا عہد کیا ہے اور اس ستم کیش کوچہ میں مجاہدانہ بانکپن سے آگے بڑھتے ہوئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا، تنہائی کے اذیت ناک دن بھی گذارے اور فیض کی طرح جبری ہجرت اور آوارگی کے ایام بھی بسر کیئے۔''

(تعبیر وتحلیل،ص:۲۴۳)

''احمد فرازؔ کی نظموں کا موضوع صرف سیاسی آشوب وابتلا نہیں ہے، غزلوں کی طرح ان نظموں کی داخلی فضا میں بھی بڑا تنوع ہے، بعض مختصر نظموں میں مخزونی کا احساس نشتر کی طرح چمک اُٹھتا ہے، دراصل احمد فراز کا تعلق نظریاتی جہاد اور اجتماعی آشوب سے وابستگی کی جس مقدس روایت سے رہا ہے وہ ان کے تخلیقی وجدان کا ایک حصہ بن چکی ہے۔''

(تعبیر وتحلیل،ص:۲۴۷،۲۴۶)

اسی طرح عزیز قیسی کے دوسرے شعری مجموعے ''گرد باد'' کے حوالے سے ان کی شاعری کے ارضی وسماجی سروکاروں کی نشاندہی کرتے ہوئے قمر رئیس رقم طراز ہیں:

''گرد باد'' کی نظموں اور غزلوں میں جس شاعر کا پیکر ابھرتا ہے وہ بے حد حساس بے چین اور بے اماں ہے لیکن اپنے اس ذاتی اضطراب کو اس نے محنت کش انسانوں کے صدیوں کے استحصال اور اضطراب سے ہم آہنگ کرلیا ہے، ان کی ازلی تشنگی کو وہ اپنی ذات کے تشنج میں محسوس کرتا ہے، لیکن یہ عمل بعض دوسرے ترقی پسند شعراؔ کی طرح سطحی اور جذباتی نہیں بلکہ گہرا اور تہہ دار ہے، اس کے نتیجے میں اس کے تخلیقی تجربات یک رُخ نہ ہوکر پہلو دار ہوگئے ہیں، احساس ومعنی کی سطح پر وہ کئی جہتوں پر محیط ہوجاتے ہیں، وہ مزدور زندہ باد کا نعرہ لگائے بغیر انسانی وقار کی پامالی اور محنت کے استحصال کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔''

(تعبیر وتحلیل،ص:۲۶۴)

ڈاکٹر قمر رئیس کا تنقیدی طریقہ کار بڑی حد تک معروضی ہے، وہ زیر مطالعہ ادیب اور ادب پارے کا دیانت دارنہ مطالعہ کرتے ہیں، نظریاتی ادعائیت سے وہ بڑی حد تک

مبرا ہیں، چنانچہ ترقی پسند اور جدید شاعری کے ساتھ ہی ساتھ لوک ادب (لوک گیت) کی ترتیب وتوقیر پر بھی وہ زور دیتے ہیں۔ ان سے قبل سردار جعفری نے بھی ''ترقی پسند ادب'' نامی اپنی کتاب میں عوامی ادب وشعر کی اہمیت کا بھرپور احساس دلایا تھا۔ قمر رئیس کے نزدیک مارکسی تنقیدی طریقِ کار میں اساساً اتنی صلاحیت وگنجائش ہے کہ وہ ادب وزندگی کے نئے اقتضیات اور امکانات سے ہم آہنگ ہوسکتی ہے۔قمر رئیس لکھتے ہیں: ''میری دانست میں مارکسی نقاد اس وسیع طریق کار کی عملی اور اخلاقی اساس پر ہی ترقی پزیر علوم (مثلاً بشریات، سماجیات، نفسیات) کے انکشافات سے تخلیقی طور پر فیض اٹھاتا آیا ہے اور اس طرح وہ ادبی تنقید کی معنویت کو نئے امکانات کے افق بھی دکھاتا رہا ہے۔'' (تعبیر وتحلیل، ص:۱۱)۔

☆☆☆

Sahifa-e-Mohabbat : Ek Jaeza by Dr. Mohd. Shamsuddin
(Asst. Regional Directer MANUU SRC, Varanasi)cell-9911487568
ڈاکٹر محمد شمس الدین (اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر، مانو، ایس آر سی، وارانسی)

صحیفہء محبت : ایک جائزہ

خطوط نگاری کا شمار اردو نثر کی غیر افسانوی اصناف میں ہوتا ہے۔ جس کو فروغ دینے میں اہم نام مرزا غالب کا ہے۔ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مہدی افادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی بھی اہم خطوط نگار میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اردو دنیا میں مہدی افادی کی شہرت ان کی خطوط نگاری سے ہوئی۔ ان کی مراسلت اس دور کے تقریباً سبھی معروف ادیبوں اور شاعروں سے تھی۔ جن میں حالی اور شبلی کے علاوہ ریاض خیر آبادی، ہوش بلگرامی، ناصر علی دہلوی، عبدالرزاق کانپوری، عبدالماجد دریابادی، سید سلیمان ندوی قابل ذکر ہیں۔

مہدی افادی کے خطوط کا مجموعہ 'صحیفہء محبت' کو محمود الٰہی نے ترتیب دے کر 1964 میں ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ سے شائع کیا۔ یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جنہیں مہدی افادی نے اپنی بیگم عزیز النسا (مہدی بیگم) کے نام لکھا تھا۔ ان میں ادبیت اس قدر ہے کہ یہ ایک عظیم ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک بار جب رشید احمد صدیقی نے محمود الٰہی سے یہ کہا کہ گورکھپور کی شخصیات پر کام کرنا تمہارے واجبات میں داخل ہے۔ یہ سنتے ہی محمود الٰہی نے مہدی افادی کے خطوط ترتیب دینے کا ارادہ کرلیا اور جلد ہی اسے عملی جامہ بھی پہنایا۔ گورکھپور کی اہم ادبی شخصیتوں میں مہدی افادی کی ایک قابل قدر حیثیت ہے۔ مہدی افادی نے یوں تو کوئی خاص کتابیں نہیں لکھیں مگر 'افادات مہدی' اور 'صحیفہء محبت' ان کے عظیم کارنامے ہیں۔

مہدی افادی 1870 کے قریب حاجی علی حسن کے یہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گھر ہی میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ البتہ مطالعہ سے دلچسپی تھی اس لیے خود

بخو دان کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا۔ ڈگری نہ ہونے کے سبب کوئی اعلیٰ عہدہ تو نہیں مل سکا مگر 1890 میں ایک کچہری میں معمولی ملازمت مل گئی۔ اس دوران اپنے فرائض کو اس قدر بحسن وخوبی انجام دیا کہ 1900 میں نائب تحصیل دار اور تقریباً 1909 میں تحصیل دار بنا دیے گیے۔ انہوں نے تین شادیاں کیں لیکن ان کی ادبی اہمیت تیسری بیوی (عزیز النسا) سے شادی کے بعد بڑھی۔ وہ 52 سال کی عمر پا کر 21 نومبر 1921 میں دنیائے فانی سے کوچ کر گیے۔ اپنی زندگی میں انہیں کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے اپنا تعلیمی سفر ہمیشہ جاری رکھا حتیٰ کہ انگریزی میں بھی کافی مہارت حاصل کر لی۔ وہ اپنے دوست شیخ محمد کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اور تو اور اس ترقی کے لیے کسی بے ایمان، توبہ! ابنائے جنس کا ممنون نہیں ہوں۔ محض خدا کی مہربانی یا دوسرے الفاظ میں وہ تصرفات جو میں نے زمانے سے ہم سطح رہنے کے لیے اپنی حالت میں کیے اور ساٹھ ستر آدمیوں کی دوڑ میں جن میں بعض بی۔ اے بھی تھے، سب سے آگے رہا۔ کوٹ پتلون کی ذمہ داری کے ساتھ اہلیت قائم رکھی۔ بھئی اسے بھی ایک ریاض سمجھنا۔ شیروانی میں یہ دقت پیش نہ آتی۔ مرمر گیا ہوں، گوری رنگت والوں (انگریزوں) کو کہیں سے چور نہ معلوم ہوؤں۔ انچ سے فٹ ضرور ہوا مگر خوش قسمتی سے گز سمجھا گیا۔ ایسے مڈل والے کہاں جو گر بیجوٹوں کا کان لیں''۔ (صحیفہء محبت ص 10 ادارہ فروغ اردو، لکھنو)

مہدی افادی انگریزی طرز زندگی اور نئے خیالات سے کافی متاثر تھے۔ اسی وجہ سے 1889 میں گورکھپور میں محمڈن کلب قائم کیا تا کہ وہ سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد اور علی گڑھ کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل کر سکیں۔ یہیں سے ان کی ادبی زندگی کی ابتداء ہوئی۔ 1890 میں انہیں تبصرہ نگاری کا شوق ہوا جس پر شبلی نے انہیں سرسید، محمد حسین آزاد اور حالی کی تصنیفات کے مطالعے کا مشورہ دیا۔ کچھ ہی دنوں بعد مہدی افادی بہترین تبصرہ نگار بن گئے۔ وہ علی گڑھ تحریک سے کافی متاثر ہوئے۔ مہدی افادی چونکہ نئے خیالات کو پسند کرتے تھے اس لیے کئی جگہ اپنے خطوط میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ جس کا ثبوت ان کا ایک خط ہے جو مہدی افادی نے اپنی بیوی کی صحت معلوم کرنے کے لیے اپنے گھر والوں کو ایک تحریر کی شکل میں بھیجا تھا جو اس وقت کے رسم و رواج کے مطابق مناسب نہ تھا۔ ان کے ماموں نے جب اس پر باز پرس کی تو مہدی افادی نے لکھا:

''

چنار 18 جون 1892

مکرمی! یاد فرمائی کا شکریہ

آپ کی جون کی تحریر میں نے تعجب سے نہیں افسوس کے ساتھ دیکھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں گے ورنہ میں نے کچھ نہ لکھا ہوتا۔ آپ جسے اپنی زبان میں بے حیائی، بے باکی اور بے شرمی کہتے ہیں وہ محض اتنی بات ہے کہ میں ہر واقعے کو اصل حالت میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ اتفاق ہے کہ ظفر علی کی بھاوج علیل ہے اور مجھے ضروری حالات کی تفتیش کرنی پڑی ورنہ میں ہر شخص کے حالات کا اس اصرار کے ساتھ طالب ہوسکتا ہوں جسے شک ہو بیمار پڑ کے دیکھ لے۔......

آپ لکھتے ہیں کہ لوگ مجھ پر ہنستے ہیں مگر آپ کو یہ نہیں معلوم کہ میں ان کی سمجھ پر روتا ہوں۔ وجہ بیان کرنے کی فرصت نہیں، جو لوگ مجھے اچھا سمجھتے تھے یا سمجھتے ہیں ان کی مہربانی اور صاف باطنی ہے، جو برا سمجھتے ہیں انہیں داخل جمادات سمجھتا ہوں جیسے کنکر پتھر وغیرہ۔ ان کی برائی سے جو بھر بھی میری حقیقت گھٹ بڑھ نہیں سکتی۔ پھر ایسوں کی شکایت کیا۔ میں تو شاید برا کہنے والوں کا قیامت میں بھی فریادی نہ ہوں گا اور اپنے پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح (روحی فداک یا رسول اللہ) اپنی طرف سے سچے دل سے معاف کر دوں گا۔

اب مجھے تھوڑا کچھ اور عرض کرنا ہے جو غالباً اس تحریر کی جان ہے۔ آپ جن باتوں کو داخل شرم سمجھتے ہیں، مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں انہیں فرض انسانی سمجھتا ہوں اور ان کی تکمیل میرے خیال میں اصل غیرت ہے۔ ہندوستانیوں میں جس قسم کے موٹے نخرے بنائی ہوئی شرم آپ دیکھتے ہیں یہ محض جہالت کا طفیل ہے۔

...... بہر حال بھول کر بھی مجھ سے ان روباہانہ طریقوں کی امید نہ کیجئے گا جو ہندوستانیوں میں رائج ہیں۔ زمانہ کا ہر قدم آگے ہے۔ زیادہ دن گزرنے نہیں پائیں گے کہ میں جس اصول کی طرف آپ کو رجوع کرتا ہوں، گھر گھر یہی ہوں گے۔ خدا نے چاہا تو مرد و عورت میں قطعی مساوات ہوگی جو اسلام کا اصل الاصول ہے۔ مری ہوئی سنتیں پھر زندہ ہوں گی۔ بیویاں براہ راست اپنے شوہروں کو لکھ سکیں گی اور کیا تعجب ہے کہ میرے خاندان میں پہلا خوش قسمت میرا پیارا ابوالمحامد ہو جس کی آئندہ زندگی کی طرف ابھی سے میری آنکھیں لگی ہوئی ہیں......''۔

(صحیفہء محبت ص 19)

اس خط سے مہدی افادی کے طرزِ فکر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس وقت ان کی فکر میں کافی تبدیلی آ چکی تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ جب انہوں نے مضمون لکھنے شروع کیے۔ ان کا سب سے پہلا مضمون 'تمدن عرب پر ایک کھلی چٹھی' ریاض الاخبار میں شائع ہوا۔ 1909ء میں ان کا مضمون 'دائرہ ءادبیہ' شائع ہوا جس میں ناصر علی اور ان کے 'صلائے عام' کی تعریف کے ضمن میں انہوں نے شباب و سرمستی کی داستان سنائی ہے اور اس داستان کا ایسا اسلوب اختیار کیا جس نے انہیں صاحب طرز انشا پرداز بنا دیا۔ حکیم برہم نے 'دائرہ ءادبیہ' پر ایک تنقیدی نوٹ لکھ کر شائع کیا اور مہدی افادی کے فکر و فن کا جائزہ کچھ ان الفاظ میں لیا:

''دائرہ ءادبیہ' کے عنوان سے اپنے محترم دوست ایم، مہدی حسن کا مضمون آج ہم درج کرتے ہیں۔ مہدی حسن کا رنگ موجودہ انشا پردازوں کے لٹریچر سے بالکل الگ ہے۔ اس رنگ کا ان کو مخترع و مبتدع کہنا بے جا نہیں ہے۔ اردو علم و ادب میں اگر اتنی جامعیت کے ساتھ چند لکھنے والے مل جائیں تو یہ اعتراض اور ناگوار اعتراض بہت جلد مٹ جائے کہ اردو زبان میں کافی سرمایہ نہیں ہے اور اس کے الفاظ موجودہ زمانے کی زبانوں کے معانی کا بارگراں نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے پاس اتنی بضاعت نہیں ہے کہ علمی خزانے کی نگہداشت اس کے سپرد کر دی جائے۔ آج کل اس امر کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ اردو لغت کے لیے علمی الفاظ تلاش کیے جائیں تا کہ سیاسیات و طبعیات اور تمام علوم حکمیہ اور فنون لطیفہ اور اقتصادیات کے معرکۃ الآرا تصانیف کے وقت اردو زبان کو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ ہم کو اس امر کا اعتراف ہے کہ دو چار صاحب اس امر کی بہت بڑی کوشش کر رہے ہیں اور اس خیال سے کہ وہ علمی کمالات اور علوم مغربیہ میں جامعیت رکھتے ہیں، کامیاب بھی ہوں گے مگر بلا خوف تردید ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسٹر مہدی حسن کے ادبی دور کی حکومت سے کوئی باہر نہیں جا سکتا۔

خوب صورت الفاظ کی ترکیب اور تراش اور موزونیت کے ساتھ ان کی ترتیب یہ مسٹر مہدی حسن کا خاص حصہ ہے اور تمام خوبیوں پر دورِ جدید میں الفاظ کے سکے ڈھالنا اور ان کو اتنا خوب صورت گڑھنا کہ دیکھنے والے دنگ ہو جائیں، مسٹر مہدی کا حسن کمال ہے۔ مقیاس الشباب اور ادب العالیہ اور ادبی تخیل اور اختصاصی اور کافوری حصہ افقی، مجمع الفصحا، اختراع

فائقہ کو دیکھ کر اور ان کے معنی سمجھ کر آپ کو یہ رائے زبردستی قائم کرنا پڑے گی کہ فاضل انشا پرداز کو علوم ادبیہ میں کہاں تک دستگاہ اور اختراعات وصناعت الفاظ میں کس درجہ قدرت حاصل ہے۔

تمام مضمون میں ہر فقرے کی ترکیب اور ترتیب اور ان کا لنگر نازک خیالی اور وسعت معلومات کی انتہائی حد سمجھنا چاہیے۔ ایسے پاکیزہ لٹریچر میں 'صلائے عام' کی جب داد دی جائے تو کیا یہ غیر ممکن ہے کہ میر ناصر علی خاں بہادر یہ تمنا کریں گے کہ کاش پھر 'ہم بیس برس کے ہوجاتے'۔ صلائے عام کو جن شریف اور دلکش الفاظ میں مبارک باد دی گئی ہے، اس کی شکر گزاری صرف مشرق ہی پر واجب نہیں ہے، ہم فرض کفایہ سے اگر سبکدوش ہوجائیں تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میر ناصر علی خاں بہادر بھی بڑھاپے کے عذر سے 'یطیقون' میں داخل ہوسکتے ہیں۔ مسٹر مہدی حسن کا لٹریچر اور ان کی زبان اتنی پیاری اور دلکش ہے کہ ہم کو رشک آتا ہے۔

ع حسرت آتی ہے کہ وہ شخص ہمیں کیوں نہ ہوئے

مشرق کو آج یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے افق میں نہایت تابناک اور روشن ستارے جلوہ گر ہیں اور یہ بات کسی اور اخبار کو بہ حیثیت مجموعی حاصل نہیں۔''

(مشرق (اخبار) 12 اکتوبر 1909)

دائرہ ادبیہ کے بعد ان کا مضمون خواب طفلی اور ارزوئے شباب شائع ہوا۔ پھر اسی کڑی کے دو اور مضامین 'فلسفہ حسن وعشق ۔ یونانیوں کے نقطہ نظر سے' اور 'بنت عم' شائع ہوئے۔ ان تمام مضامین میں انہوں نے اپنے رشتہ ازدواج کا ذکر کیا ہے۔ مہدی افادی نے چند رومانی مضامین بھی لکھے ہیں مگر وہ بنیادی طور پر نقاد تھے اور ترقی پسند مصنفین نے اردو تنقید کے ارتقاء میں جو کوششیں کیں، اس میں مہدی افادی کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ انہوں نے تنقید کو تحقیق کا پابند بنانے پر زور دیا۔

مہدی افادی اپنی بیگم سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور ان پر جان دینے کے لیے بھی تیار رہتے تھے۔ جس کا اندازہ ان کے خطوط پڑھنے کے بعد بخوبی ہوتا ہے۔ ان خطوط میں اکثر انشا پردازی کے بہتر نمونے ملتے ہیں جو افادات کے مضامین کی یاد دلاتے ہیں۔ خطوط کا، ادب کی اس صنف سے تعلق ہے جس کا کوئی موضوع متعین نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس میں بھی

الگ الگ عنوان کے خطوط ملیں گے۔ مہدی افادی اپنے اور مہدی بیگم کے خطوط کو 'صحیفہ ءمحبت' یا 'صحیفہ ءعشق' کہا کرتے تھے۔ اسی لیے اس کا نام صحیفہ ءمحبت رکھا گیا۔ ان کے یہ خطوط بارہ سال کی مدت پر محیط ہیں مگر مہدی افادی کی محبت میں کہیں بھی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ جس طرح پہلے خط میں اپنی محبت کا ذکر کیا ہے، وہی انداز ان کے آخری خط میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے چند خطوط پیش ہیں:

خط نمبر 1۔

''تحصیل الٰہ آباد، 31.10.1909

میری پیاری بیوی

آدم کو بہشت چھوٹنے کا اس قدر صدمہ نہ ہوا ہوگا جتنا مجھے مٹھیا (جگہ کا نام) سے جدائی کا۔ ان کی حوّا ان کے ساتھ آئی تھی لیکن 'میری' مرے پاس نہیں ہے۔ تم سے رخصت ہوکر ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ عورت کا سب سے بڑا حربہ اس کے آنسو ہیں۔ تمہارے رخصتی آنسوؤں نے مجھے قریب قریب بے کار کر رکھا ہے۔ آج تیسرا روز ہے کہ تم سے جدا ہوا ہوں لیکن کچھ خبر بھی ہے میری کیا حالت ہے؟ تفصیل کی تاب نہ لاسکوگی۔ نہ میں تمہارے آتشِ محبت کو بھڑکانا چاہتا ہوں۔۔۔۔

آج دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش نصیب کون ہے؟ لیکن دل کی دھڑکن اب کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ عزیز!......تو ہر وقت آنکھوں میں پھرتی ہے۔ تیرا ایک ایک فقرہ، ایک ایک بات رہ رہ کر تڑپاتی ہے۔ اور سب سے زیادہ تیری قدر دانیاں اور تیری شرافتِ نفس!

ہمیشہ اس پر فخر کروں گا کہ تو نے میری پاکبازی کی سچی داد دی۔ صرف اتنی سی بات، میری زندگی کا تریاق ہے اور اس کا معاوضہ۔ اگر میں اپنی جان بھی نثار کردوں تو نہیں ہوسکتا۔ تیری سچی محبت میرا سرمایہ ءنشاط ہے جس نے میری رگوں میں خون کی گردش بڑھا دی ہے۔ جانِ مہدی، تیری وجہ سے وہی زندگی جس سے گھبراتا تھا، کس قدر عزیز ہوگئی ہے! اُو خدا تو اس حالت کو قائم رکھیو... تیری ذات کے سوا کوئی سہارا نہیں تھا۔

عزیز!... کیا محبت اسی کا نام ہے کہ تڑپ اور بڑھ جائے؟ اپنی صحت کا خیال رکھنا۔ میری زندگی صرف تمہارے دم تک ہے۔ طرح طرح کے وہم آتے ہیں۔ میری تحریر کے انتظار میں

اگر تم نے خط نہیں لکھا تو دن نہیں کٹیں گے۔ بے قراری حد سے گزر چکی ہے۔...... خدایا خیر
صرف تمہارا......مہدی'' (صحیفۂ محبت ص39 ادارہ فروغ اردو، لکھنئو)

خط نمبر 2۔

''تحصیل سورام 18.09.1910

میری جان!

خط نمبر 19 ملا جس سے ایک طرح کی افسردگی پائی جاتی ہے۔ ہاں یہ میری بیتابی دل کا قصور ہے جس سے میرے ساتھ تم بھی پریشان ہوتی ہو لیکن اب کوئی مایوسانہ فقرہ میری زبان سے نہیں سنوگی۔ ابھی مجھ پر بھروسہ کرو اور سب اگلی پچھلی دل سے نکال ڈالو۔

اس حور لقا کو گھر لائے، ہو تم کو مبارک اے اکبؔر
لیکن یہ قیامت کی تم نے جو گھر سے نکلنا چھوڑ دیا

شعر حضرت اکبؔر کا تھا۔ مجھ پر چوٹ کی ہے جسے دل گیر نے 'مشرق' میں چمکایا ہے۔ یعنی جب سے تم ملی ہو، میں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا جس کی شکایت ہے۔ اسی کو میں نے لکھا تھا کہ اگر زندگی باقی ہے تو پھر کبھی!...

کل کی تحریر اس قدر پیاری تھی کہ ابھی تک خمار باقی ہے۔ تم مجھ سے جم کر سینہ بہ سینہ لڑنے پر تلی رہتی ہو۔ بے اختیار ہنس پڑتا ہوں۔ میرا ایک فقرہ بھی جمنے نہیں دیتی۔ اتنی شرارت سچ بتا کہاں سے سیکھی؟ انہیں اداؤں کا تو گرویدہ ہوں۔ عورت اگر حسین ہو اور پارسا اور ساتھ ہی شوہر کی اتنی دلدادہ کہ خیالِ غیر پاس نہ آئے تو پھر دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ نہ ایسی باوفا کے ہوتے کسی چیز کی ضرورت ہے لیکن جب اس میں تمام صفات نسوانی بھی موجود ہوں یعنی ذہین ہو، زندہ دل ہو، نفیس پسند، خوش مذاق اور شائستہ خیال ہو۔ بجلی کی سی تڑپ رکھتی ہو تو اس پر قابو پانے والے کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ لیکن...... جو ان صفاتِ خاص میں عورت پر غالب ہو۔ دیکھ کس خوبصورتی سے اپنی تعریف کر گیا!

پیاری! مجھے یہ فخر ہے کہ تیری سی بیوی مجھے خدا نے دی۔ تو بیوی ہی نہیں ہے، میرے دل کی مالک ہے اور میری ہمراز ہے۔ یہ بات کہیں اور کہاں؟...

میری جان! تم کو مجھ سے جس قدر شکایت ہو، کسی وقت دل جلتا ہو تو خوب یاد رکھنا یہ

دیوانگی کا اثر ہے جو حد سے گزری ہوئی ہے۔خیالِ عیش سے سیری ہو چکی کہ وہ زیادہ سے زیادہ 'کھسیانی بلی کھمبا نوچے' کا مصداق ہے۔

گھر کی مرغی ہی تو نہیں ہو... لیکن سو رام کو گھر آنگن بنا کے رہتی! ایک طرف یہ کج ادائی ہے اور پھر یہ دعویٰ کہ 'دنیا میں آپ پر یوں مٹنے والی دوسری پیدا نہیں ہوئی'۔ تر ساؤ اور کہو کہ 'جان دیتی ہوں'۔

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ خط نمبر 15 اور 16 ملے۔

''بلا کی کمزوری ہے جس سے طبیعت ہر وقت گری گری سی رہتی ہے۔ چار پانچ روز سے کھانسی بھی آتی ہے۔''

بجلی کی طرح یہ فقرے چمک کر آنکھوں کے سامنے آئے اور جان ہی تو نکل گئی۔

پیاری! سینہ تو محفوظ ہے؟ ڈاکٹر کو دکھاؤ اور ...... بو آپسی ڈاک مجھے اطمینان دلاؤ۔انشا پردازی سر دست رخصت! صرف ایک فقرہ اور لو۔ام لئیق (مہدی بیگم کی دوست) کے نام سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہارون رشید کی حرم کی ہوگی لیکن یہ وہی بی سندر جان ہیں... سفید رنگ والیوں سے یہی کہہ رکھو...

مہدی''

(صحیفہء محبت ص 70)

مکتوب نگاری میں مہدی افادی شبلی کے رنگ کے مداح اور انہیں کے پیرو کار تھے۔ وہ اپنے خطوط میں مکتوب الیہ کی ذات کو زیادہ توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔لیکن اس سے بھی زیادہ توجہ حسنِ بیان اور ادیبانہ شان پر دیتے ہیں۔ ان کے کم وبیش ہر خط میں ادبیت کی چاشنی موجود رہتی ہے۔اور وہ اپنے مخصوص اسلوب بیان کی وجہ سے ہمیشہ قارئین کی دل چسپی کا مرکز بنے رہیں گے۔وہ حسن پرست تھے اور ان کا ادبی ذوق رچا ہوا تھا۔

مہدی بیگم جن کے نام یہ خطوط لکھے گئے وہ اردو دنیا کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ افادات مہدی پر تبصرہ کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے سچ کہا کہ مہدی بیگم نے اپنے شوہر کی زندگی میں ان کی بہترین خدمت کی ہوگی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے مرنے کے بعد جو خدمت انہوں نے اپنے شوہر کی انجام دی وہ گزشتہ سے کئی گنا بہتر اور گراں تر ہے۔

یہ بات حقیقت ہے کہ مہدی بیگم اگر 'افادات مہدی' اور 'صحیفۂ محبت' شائع کرنے کی کوشش نہ کرتی تو شاید مہدی افادی کو وہ ادبی حیثیت حاصل نہ ہو پاتی جو ابھی حاصل ہے۔ مہدی بیگم بذات خود ایک ادبی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے خطوط میں بھی بالکل وہی انداز ملتا ہے جو مہدی افادی کا طرہ ٔامتیاز تھا۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مرحوم نے ان کی تعلیم و تربیت اپنے ہی اصول پر کی تھی کہ وہ بالکل ان کا عکس اور آئینہ بن گئیں۔ انتہا یہ ہے کہ طریقۂ تحریر اور خط میں بھی اپنے شوہر مرحوم کی پوری تقلید انہوں نے کی۔ اب جب کبھی ان کا خط آتا ہے، دل کانپ جاتا ہے کہ الٰہی! مہدی مرحوم کی تحریر۔''

(معارف اکتوبر 1923)

پروفیسر محمود الٰہی لکھتے ہیں کہ 1921 میں جب مہدی افادی کا انتقال ہوا اور ایک طویل مدت کے بعد یعنی 1958 میں جب گورکھپور یونیورسٹی گئے تو مہدی بیگم کی اس طویل بیوگی زندگی کا بذات خود مشاہدہ کیا۔ مہدی افادی کا مزار ان کے گھر کے آنگن کے ایک گوشے میں تھا۔ میں جب مقبرے میں داخل ہوا تو مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ اس کی مجاور نے اسے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ روزانہ قبر پر چراغ جلانا، اپنے ہاتھ سے سفیدی کرنا، ایصال ثواب پہنچانا اور پھر اس صحیفۂ محبت کے بعض خطوط کی تلاوت کرنا ان کا معمول تھا۔ آج وہ جب معذور ہو گئی ہیں پھر بھی وہ ایسے کمرے میں ہیں جس کے کھڑکی سے مقبرے کی دیواریں دکھائی دیتی ہیں اور ان کا پلنگ بھی اسی کھڑکی کے پاس ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی کو خطوط شائع کرنے کی اجازت تو مہدی بیگم نے 1959 میں ہی دے دی تھی۔ مگر وہ خطوط 1963ء میں شائع ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ محمود الٰہی کو یہ سوال ہمیشہ پریشان کرتا رہا کہ آخر ایسے خطوط کا شائع کرنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ آخر کار جب پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر احتشام حسین نے شائع کرنے پر اطمینان کا اظہار کیا تو وہ خطوط شائع ہو سکے۔ ان خطوط میں کئی جگہ بے ربطی معلوم ہوتی ہے جس کا سبب یہ ہے کہ مہدی بیگم نے خطوط سے وہ جملے حذف کر دیے ہیں جن کی اشاعت مناسب نہیں تھی۔ اس تعلق سے خود ان کے الفاظ ہیں:

''ہاں تو اسی زمانے میں میں نے ان کی وفات کے بعد اس خیال سے کہ میرے بعد یہ خطوط

بچوں کے ہاتھوں میں جائیں گے، ہر خط میں صفحے کے صفحے قلم زد کر کے ان پر سادے کاغذ چپکا دیے۔ (نقوش مکاتیب نمبر جلد دوم ص920)

مہدی افادی کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر مظہر مہدی لکھتے ہیں:

''مہدی افادی کے خطوط میں دلی جذبہ، احساس اور کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے خطوط کے مطالعہ سے ان کے مزاج اور ان کی پسند و ناپسند اور ان کی دلچسپیوں کا بھی بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے خطوط میں ان کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ ان کے خطوط میں آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی بھی پائی جاتی ہے۔ مہدی افادی کی زبان میں مشکل پسندی اور بوجھل پن کے ساتھ رنگینی اور رومانیت ملتی ہے اور یہی ان کی زبان اور اسلوب کی خصوصیت ہے جو ان کو صاحب طرز نثر نگار کا درجہ عطا کرتی ہے۔'' (بیسویں صدی میں اردو ادب، ص346)

پروفیسر محمود الٰہی نے مہدی افادی کے خطوط کو شائع کر کے اہم کارنامہ انجام دیا۔ مہدی افادی کے خطوط سے ان کی ادبی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بالکل نجی خطوط ہیں جس میں انسان ادبیت کا لحاظ کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ پھر بھی ان خطوط سے ان کی ادبیت ظاہر ہوتی ہے۔ محمود الٰہی نے اس کام سے اردو ادب میں عظیم خدمت انجام دی ہے کہ اگر وہ ان خطوط کو شائع نہ کرتے تو شاید ایک اہم شخصیت کے ادبی کارنامے منظر عام پر نہ آپاتے جبکہ مہدی افادی کے خطوط اردو ادب کا اہم حصہ ہیں۔ ان کے خطوط سے جہاں ان کی ادبیت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مغربیت سے کس قدر متاثر تھے۔ انگریزی طرز زندگی انہیں بہت پسند تھی اور وہ اسے اپنانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

☆☆☆

Jagan nath Azad Bahaisiyat Shair : Ek Tanqidi-o-Tahqiqi Mutalea by

Dr. Shafiq Ahmed Katoch (Associate Professor, dept. of Urdu GDC

Government Degree College, Banihal)

ڈاکٹر شفیق احمد کٹوچ

(ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہء اردو جی۔ڈی۔سی۔ گورنمنٹ ڈگری کالج بنہال، جموں وکشمیر)

جگن ناتھ آزاد بحیثیت شاعر: ایک تنقیدی وتحقیقی مطالعہ

اردو شاعری کی روایت میں بعض شعراء ایسے ہیں جنھوں نے محض شعر کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے عہد کی فکری، تہذیبی اور انسانی قدروں کو اپنی تخلیقات کا بنیادی حوالہ بنایا۔ ایسے شعراء میں جگن ناتھ آزاد کا نام نہایت احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، نقاد، محقق، ماہرِ اقبالیات، صحافی اور ادیب تھے، لیکن ان کی اصل شناخت ایک ایسے شاعر کی ہے جس نے انسانی رشتوں، محبت، رواداری، امن، وطن دوستی اور اخلاقی اقدار کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا۔ ان کے یہاں جذبات کی شدت ضرور ہے مگر یہ شدت کبھی شور میں تبدیل نہیں ہوتی بلکہ وقار، توازن اور فکری سنجیدگی کے ساتھ قاری کے دل میں اترتی ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی شاعری اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ ادب کا اصل مقصد انسان کے باطن کو روشن کرنا اور اسے اپنی ذات سے آگے پوری انسانیت کے دکھ درد سے وابستہ کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار وقتی سیاسی نعروں سے بلند ہو کر آفاقی انسانی شعور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں محبت صرف فرد سے فرد کا تعلق نہیں بلکہ انسان سے انسان کا رشتہ بن جاتی ہے، جبکہ وطن محض جغرافیہ نہیں بلکہ تہذیب، یاد، شناخت اور جذبات کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی شخصیت ایک ایسے ادیب کی شخصیت ہے جس کی تربیت علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی۔ ان کے والد تلوک چند محروم خود معتبر شاعر تھے، اس لیے شعر و ادب کی فضا انھیں بچپن ہی سے میسر آ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں مصنوعی پن

نہیں بلکہ فطری روانی اور شعری سلیقہ ابتدا ہی سے نمایاں نظر آتا ہے۔

اگرچہ انہوں نے کم عمری میں شعر کہنا شروع کیا، لیکن جلد ہی یہ واضح ہو گیا کہ ان کا رجحان محض روایتی غزل گوئی تک محدود نہیں رہے گا۔ انہوں نے غزل کی کلاسیکی روایت سے فیض حاصل کرتے ہوئے اس میں جدید انسان کے مسائل، نفسیاتی کیفیتوں اور سماجی شعور کو بھی جگہ دی۔ یہی امتزاج ان کی شاعری کو ان کے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف ان کا انسانی رویہ ہے۔ انہوں نے مذہب، نسل، قوم اور سیاسی وابستگی سے بلند ہو کر انسان کو اپنی شاعری کا محور بنایا۔ ان کے نزدیک انسان کی اصل عظمت اس کے کردار، اخلاق اور محبت میں پوشیدہ ہے، نہ کہ اس کی مذہبی یا نسلی شناخت میں۔ اسی انسانی فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

اشرف المخلوقات ہے یا ہے کوئی کرمِ حقیر بک رہا ہے کس طرح سے آدمیت کا ضمیر

یہ شعر صرف اخلاقی زوال کی شکایت نہیں بلکہ جدید تہذیب پر ایک گہرا سوال بھی ہے۔ شاعر محسوس کرتا ہے کہ ترقی، طاقت اور مادّی آسائشوں کے باوجود انسان اپنی اصل روحانی اور اخلاقی شناخت سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ آزاد کی یہی فکر انہیں محض غزل گو شاعر نہیں بلکہ ایک سماجی مفکر کے طور پر بھی نمایاں کرتی ہے۔ ہر بڑے شاعر کی طرح جگن ناتھ آزاد کے یہاں بھی غم ایک بنیادی احساس ہے، لیکن ان کا غم ذاتی محرومیوں تک محدود نہیں رہتا بلکہ پوری انسانیت کے دکھ میں ڈھل جاتا ہے۔ وہ فرد کے آنسو کو معاشرے کے اجتماعی کرب سے جوڑ دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی شاعری میں غم، مایوسی کا نہیں بلکہ شعور اور بیداری کا استعارہ بن جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

میں ہر غمِ جہاں سے گزرتا چلا گیا اک ترے غم نے کتنا بڑا آسرا دیا

یہاں "غم" انسان کو توڑنے کے بجائے اسے داخلی قوت عطا کرتا ہے۔ یہی تصور ہمیں اقبال کے ہاں بھی ملتا ہے، لیکن آزاد نے اسے زیادہ نرم، انسانی اور جذباتی پیرائے میں پیش کیا ہے۔

اقبال کے اثرات اور فکری وابستگی: جگن ناتھ آزاد پر علامہ اقبال کے اثرات نمایاں ہیں، لیکن انہوں نے اقبال کی تقلید نہیں کی بلکہ ان کی فکری روایت کو اپنے تجربات کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔

اقبال نے خودی، حرکت اور عشق کا فلسفہ پیش کیا، جبکہ آزاد نے انہی تصورات کو انسان دوستی، امن اور اخلاقی شعور سے جوڑ دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

عشق نے عقل کو یہ کہہ کے اجازت دی ہے — اب ترا ذوقِ تگ و تاز جہاں تک پہنچے

اس شعر میں عشق جذباتی کیفیت نہیں بلکہ تخلیقی توانائی کی علامت ہے۔ یہی تصور اقبال کے فلسفہءِ عشق کی بازگشت بھی معلوم ہوتا ہے، تاہم آزاد کے یہاں اس میں شدت کے بجائے توازن اور وقار نمایاں ہے۔ جگن ناتھ آزاد نے کلاسیکی غزل کی روایات کو پوری محبت سے اپنایا، لیکن وہ محض ماضی پرست شاعر نہیں تھے۔ انہوں نے روایت کو زندہ رکھتے ہوئے جدید زندگی کے مسائل کو بھی اپنی شاعری میں شامل کیا۔ ان کے یہاں میر کی سادگی، غالب کی فکری گہرائی اور اقبال کی بلند نظری کے اثرات محسوس ہوتے ہیں، مگر ان کا لہجہ اپنی انفرادی شناخت رکھتا ہے۔ اسی اعتماد کا اظہار وہ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں:

اے اہلِ نظر! ایک نظر مری غزل بھی — ممکن ہے کہ میرا ہو اندازِ بیاں کچھ اور

یہ شعر ان کی تخلیقی خود اعتمادی کا آئینہ دار ہے۔ وہ روایت سے وابستہ رہتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ نازش پرتاپ گڑھی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

" آزاد کی غزلوں میں ہمیں اُس زندگی کے نقوش، غیر فانی نقوش نظر آتے ہیں جو کہیں دور آسمانوں میں نہیں بلکہ زمین پر پرورش پاتی ہے اور رینگ رینگ کر آگے بڑھتی ہے۔ زبان اور بیان کی تمام تر خوبیوں کے ساتھ آزاد کی غزلوں میں تاثرات کے واضح نقوش اور سچے جذبات کی گہری پرچھائیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں اور انہیں چیزوں کی بنا پر آزاد کے اسلوب میں بڑی حد تک انفرادیت آچکی ہے۔"

(جگن ناتھ ازاد اور اس کی شاعری، مرتب حمیدہ سلطان احمد، ص، ۹۵)

شعر:

اے دوست تری یاد نے بخشا وہ سہارا — ہر تلخیِ دوراں کو کیا ہم نے گوارا

جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا ایک اہم وصف اس کا اخلاقی اعتدال ہے۔ انہوں نے کبھی اشتعال انگیزی، نفرت یا سطحی جذباتیت کو اپنی شاعری کا حصہ نہیں بنایا۔ ان کے نزدیک شاعر کی اصل ذمہ داری معاشرے میں شعور، محبت اور برداشت کو فروغ دینا ہے۔ اسی لیے

جب وہ اپنے عہد کی بے راہ روی پر تنقید کرتے ہیں تو لہجہ شائستگی سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ غصے کو بھی تہذیب کے دائرے میں رکھتے ہیں۔ یہی ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کی انفرادیت ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی ابتدائی شعری شخصیت کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ وہ محض غزل کے شاعر نہیں بلکہ انسانی شعور کے ترجمان ہیں۔ ان کی شاعری میں روایت کی خوشبو بھی ہے اور عصری احساس بھی، عشق کی لطافت بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی، وطن کی محبت بھی ہے اور پوری انسانیت کا درد بھی۔ یہی جامعیت ان کے فن کو اردو شاعری میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے اور انہیں اپنے عہد کے معتبر شعرا کی صف میں نمایاں کرتی ہے۔ اگلے حصے میں میں " ہجرت، وطن، غزل کا فنی و جمالیاتی مطالعہ، زبان و اسلوب، فکری جہات اور تنقیدی تجزیہ " کو اسی تحقیقی معیار کے ساتھ مزید تفصیل سے پیش کروں گا، تاکہ آخر میں ایک مکمل اور مربوط مقالہ تیار ہو جائے۔

جگن ناتھ آزاد کی شاعری کا دوسرا دور فکری بلوغت، تہذیبی شعور اور انسانی درد کا عکاس ہے۔ ہجرت نے ان کی شخصیت کو زخمی ضرور کیا، لیکن اسی تجربے نے ان کے فن کو وسعت، گہرائی اور آفاقیت عطا کی۔ ان کی غزل روایت سے جڑی ہوئی ہونے کے باوجود اپنے عہد کے مسائل کی مکمل ترجمان ہے۔ زبان کی شگفتگی، اسلوب کی سادگی، فکر کی پختگی اور جذبے کی صداقت نے ان کی شاعری کو اردو ادب میں ایک مستقل مقام عطا کیا ہے۔

اردو غزل کی تاریخ میں ہر بڑے شاعر نے روایت سے اپنا رشتہ ضرور قائم رکھا ہے، لیکن کامیاب شاعر وہی قرار پاتا ہے جو روایت کی تقلید کرنے کے بجائے اس میں اپنے عہد کے شعور کو شامل کر دے۔ جگن ناتھ آزاد اسی قبیل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے میر کی سادگی، غالب کی فکری گہرائی اور علامہ اقبال کی بلند نظری سے استفادہ ضرور کیا، لیکن ان کی شاعری کسی ایک شاعر کی تقلید نہیں بلکہ ان کے اپنے منفرد شعری شعور کی آئینہ دار ہے۔ وہ خود اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں:

شعر کا انداز اے آزادؔ اپنا ہے مرا ہوں میں عاشق لہجہ غالب کا، طرزِ میر کا

یہ شعر ان کے ادبی شعور کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ وہ کلاسیکی روایت کو اپنے لیے سرمایہ سمجھتے ہیں، لیکن اس روایت کو نئی فکری جہت عطا کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک روایت کا مطلب جمود نہیں بلکہ تخلیقی تسلسل ہے۔ اسی تصور کو ایک اور شعر میں یوں پیش کرتے ہیں:

پرانے دور کا دامن نہ ہاتھ سے نکلے   نقوش ابھی نہیں واضح نئے زمانے کے

یہ شعر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ادب میں جدت اسی وقت با معنی ہوتی ہے جب وہ روایت کی مضبوط بنیادوں پر استوار ہو۔

علامہ اقبال کے فکری اثرات: جگن ناتھ آزاد کی شاعری پر علامہ اقبال کے اثرات نہایت واضح ہیں، لیکن ان اثرات کی نوعیت تقلیدی نہیں بلکہ تخلیقی ہے۔ اقبال نے عشق، خودی، عمل اور حریتِ فکر کو اپنی شاعری کا بنیادی موضوع بنایا، جبکہ آزاد نے انہی افکار کو انسان دوستی، اخلاقی ذمہ داری اور تہذیبی ہم آہنگی کے ساتھ جوڑ دیا۔ ان کی شاعری میں اقبال کی طرح مایوسی کی بجائے امید، جمود کی بجائے حرکت اور نفرت کی بجائے محبت کا پیغام ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

عشق نے عقل کو یہ کہہ کے اجازت دی ہے   اب ترا ذوقِ تگ و تاز جہاں تک پہنچے

یہاں عشق جذباتی کیفیت نہیں بلکہ تخلیقی قوت اور فکری بیداری کی علامت ہے۔ اگرچہ جگن ناتھ آزاد نے کلاسیکی غزل کی روایت کو اپنایا، لیکن ان کے موضوعات مکمل طور پر جدید ہیں۔ انہوں نے ایسے انسان کی تصویر کشی کی ہے جو صنعتی تہذیب، مادہ پرستی، سیاسی انتشار، معاشرتی بے یقینی اور اخلاقی بحران کے درمیان اپنی شناخت تلاش کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری صرف حسن و عشق کی داستان نہیں بلکہ جدید انسان کی داخلی کشمکش کا آئینہ بھی ہے۔ مثلاً:

داخل ہوئی ہے ایک نئے دور میں حیات   اب ہم ہیں اور خواب پریشاں نئے نئے

یہ شعر بدلتے ہوئے عہد کی نفسیاتی کیفیت کو انتہائی اختصار اور فنکارانہ انداز میں بیان کرتا ہے۔

سماجی شعور اور عصری آگہی: جگن ناتھ آزاد ان شعرا میں شامل ہیں جنہوں نے ادب کو محض ذاتی جذبات کے اظہار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بھی بنایا۔ تاہم ان کی اصلاح پسندی نعرہ بازی سے پاک ہے۔ وہ انسان کو بدلنے کی دعوت دیتے ہیں، کسی مخصوص نظریے کی تبلیغ نہیں کرتے۔ معاشرتی تضادات پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ سیاسی منافقت، اخلاقی انحطاط، معاشی استحصال اور انسانی بے حسی پر مسلسل اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

عبدالماجد دریا آبادی ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جگن ناتھ آزاد اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ نثر کے بھی اچھے اور سلجھے ہوئے لکھنے والوں میں ہیں۔

اُن کے یہ تین لیکچر شعر و ادب، نقد و نظر اور اسلامیات کے طلبہ کے پڑھنے کے قابل ہیں۔ سلیس، شگفتہ انداز میں باتیں خوب پتے کی کہہ گئے ہیں، اور حقیقت وتصوف وغیرہ کے سلسلے میں باتوں باتوں میں جا بجا ایسے نکتے بیان کر گئے ہیں جو کسی غیر مسلم کیا، بہت سے مسلم فضلاء کے لیے بھی باعثِ فخر ہو سکتے ہیں۔"

(عبدالماجد دریا آبادی، بحوالہ: جگن ناتھ آزاد: اردو ادب کی آبرو، ص 46)

ان کا یہ شعر عصر حاضر کی اخلاقی صورت حال کی بہترین عکاسی کرتا ہے:

نظر ان کی، زباں ان کی، میں کس کو معتبر سمجھوں　　نظر کچھ اور کہتی ہے، زباں کچھ اور کہتی ہے

جگت ناتھ آزاد کی شاعری اردو ادب کی اُس روشن روایت کی نمائندہ ہے جس میں انسان دوستی، تہذیبی ہم آہنگی، حب الوطنی، جمالیاتی شعور اور فکری اعتدال یکجا نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں نہ جذبات کی شدت بے قابو ہوتی ہے اور نہ ہی فکر کی گہرائی اظہار کی سادگی کو متاثر کرتی ہے۔ وہ کلاسیکی شعری روایت سے وابستہ رہتے ہوئے جدید عہد کے مسائل، انسانی دکھ، تقسیمِ ہند کے المیے، امن کی آرزو اور مشترکہ تہذیب کے خواب کو نہایت مہذب اور دل نشیں انداز میں پیش کرتے ہیں۔ آزاد کی غزل میں عشق اپنی روایتی معنویت کے ساتھ موجود ہے، مگر اس میں انسانیت، اخلاق اور سماجی شعور کی آمیزش اسے ایک وسیع تر تناظر عطا کرتی ہے۔ ان کی نظموں میں قومی یکجہتی، تہذیبی شناخت اور انسانی رشتوں کی حرمت نمایاں موضوعات ہیں۔ ان کے شعری لہجے میں شائستگی، نرم آہنگی اور فکری وقار اس درجہ نمایاں ہے کہ قاری محض الفاظ سے نہیں بلکہ ایک مہذب ذہن اور حساس دل سے بھی آشنا ہوتا ہے۔

لسانی اعتبار سے جگت ناتھ آزاد کی شاعری سادہ، رواں، شستہ اور ادبی وقار کی حامل ہے۔ وہ مشکل لفظیات یا غیر ضروری صنعت گری کے بجائے خیال کی لطافت اور جذبے کی صداقت کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام خواص کے ساتھ ساتھ عام قارئین کے لیے بھی دل کش اور قابلِ فہم ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ جگت ناتھ آزاد کی شاعری محبت، امن، رواداری اور انسان دوستی کا شعری استعارہ ہے۔ ان کا ادبی سرمایہ اردو شاعری میں ایک ایسے شاعر کی شناخت قائم کرتا ہے جس نے لفظ کو انسانیت کی خدمت اور تہذیبی رشتوں کے استحکام کا وسیلہ بنایا۔ ان کی شاعری آج بھی اپنے مثبت پیغام، فکری توازن اور جمالیاتی حسن کے باعث

تازگی، معنویت اور ادبی وقار کی حامل محسوس ہوتی ہے۔

حوالہ جات (Bibliography)

جگن ناتھ آزاد۔ بیکراں۔ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

جگن ناتھ آزاد۔ وطن میں اجنبی۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

جگن ناتھ آزاد۔ ستاروں سے ذروں تک۔ اردو اکادمی دہلی۔

جگن ناتھ آزاد۔ اقبال: ذہن وفن۔ اقبال اکیڈمی، لاہور۔

آل احمد سرور۔ اردو شاعری اور تہذیب۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

وزیر آغا۔ جدید اردو شاعری۔ سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

گوپی چند نارنگ۔ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

محمد حسن۔ جدید اردو ادب۔ راج کمل پرکاشن، دہلی۔

شمس الرحمن فاروقی۔ شعر، غیر شعر اور نثر۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔

عبدالمغنی۔ اردو تنقید کے مباحث۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ابوالکلام قاسمی۔ اردو تنقید کے نئے زاویے۔ نئی دہلی۔

محمد صابر حسین۔ اردو غزل کا ارتقاء۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی۔

☆☆☆

Gojri Novel ka Aghaz-o-Irteqa by Ajaz Ahmad Chachi (Poonch)
اعجاز احمد چیچی (پونچھ) Cell-9797315334

گوجری ناول کا آغاز وارتقاء

گوجری ناول کا آغاز:

ناول ایک طویل نثری صنف ہے، جو اطالوی زبان کے ناویلا لفظ سے بنا ہے۔ گوجری ادب کے شروعاتی دور میں شعروشاعری کا زیادہ رواج رہا ہے جبکہ گوجری نثر بیسویں صدی کی نصف دہائی کے بعد کی پیداوار ہے۔ اسی متعلق ڈاکٹر رفیق انجم لکھتے ہیں:

''جدید گوجری ادب کی ابتدا بیہویں صدی کے نال ہی ہوتے ات وی شاعری کی حکمرانی سئی لگے۔ اس صدی کا وی پہلا پنجاہ سال مانھ لکھی جان آلی گوجری کو کوئی نثری نمونو نہیں لبھتو۔ تے اسطرح ثابت یاہ ہوجے گوجری کو نثری ادب 1950ء تیں بعد کی پیداوار ہے۔''

(گوجری نثریات، ڈاکٹر رفیق انجم، ص22، ع2020ء)

ظاہر ہے کہ شروعات میں گوجری نثر مضامین کی صورت میں نمودار ہوئی ہوگی۔ پھر گوجری ادب میں رفتہ رفتہ نثری اصناف کا وجود ظاہر ہوا ہوگا۔ ہمارا موضوع گوجری ناول پر ہے اس لیے اِدھر اُدھر کی گفتگو سے پرہیز کرتے ہوئے ہم اپنے موضوع کے اردگرد رہیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔ ارتقائی سفر سے قبل گوجری ناول کی شروعات کب اور کس نے کی؟ یہ جاننا بہت لازمی ہے۔ اسی حوالے سے ڈاکٹر رفیق انجم لکھتے ہیں:

''غلام رسول اصغر گوجری کہانی تے افسانا کی حداں تیں اگے لنگھن آلا پہلا لکھاڑی ہیں جنھاں نے 1990ء مانھ گوجری کو پہلو ناول '' آخری سہارو'' شائع کیو جس پر انھاں نا اکیڈمی ایوارڈ وی ملیو۔'' (گوجری نثریات، ڈاکٹر رفیق انجم، ص482، ع2020ء)

مذکورہ بالا اقتباس سے گوجری ناول کی ابتداء کے متعلق معلوم ہوا کہ غلام رسول اصغر نے " آخری سہارو" کے نام سے ناول لکھ کر گوجری ناول کی بنیاد رکھی۔ حالانکہ ناول کتاب پر پہلے اڈیشن کی سن اشاعت 1989ء ہے۔ اسی سن اشاعت کی تصدیق عبداللطیف بجران اپنی

کتاب میں کرتے ہیں کہ:

" گوجری کو پہلو ناول 1989ء مانھ شائع ہون آلو جناب غلام رسول اصغر کو ناول ''آخری سہارو'' ہے۔ (دوحرف،عبداللطیف بجران،ص117،ع2021ء)

مصنف کی ادبی زندگی کے پیچھے کس شخصیت کا ہاتھ رہا،جن کی کاوشوں سے موصوف نے گوجری ناول لکھ کر جہاں گوجری ناول کی بنیادرکھی وہاں گوجری نثر کی ترقی میں اہم کردار بھی ادا کیا۔موصوف کے سر سے والدین کا سایہ بچپن سے ہی اُٹھ گیا تھا جس کے بعدان کے بڑے بھائی چوہدری مقبول ہکلہ نے نہ صرف پرورش کی بلکہ تعلیمی سفر کے ساتھ ساتھ ادبی دنیا کا ہیرو بنانے میں بھی اہم کردارادا کیا۔ان کے متعلق غلام رسول اصغر لکھتے ہیں کہ:

''آخری سہارو'' ناول مقبول صاحب کی ہی دین کو نتیجو ہے۔وراج مناں ڈکھ اس گل کو ہے جے اس ناول کا چھپن وروے اَج مہارادرمیان نہیں ہیں تے 16 ستمبر 1980ء ناں اس دارفانی تیں چلے گیا۔خدا انھاں ناں جوار رحمت ماں جگہ دے۔آمین۔یہ ناول مرحوم کی یاد ماں ہی چھاپیو گیو ہے۔''(آخری سہارو،غلام رسول اصغر،ص02،ع1989ء)

جہاں ایک طرف موصوف کو گوجری ناول کی بنیادرکھنے پر مسرت تھی وہاں بڑے بھائی کی موت کا رنج بھی دکھائی دیتا ہے۔جن کی محنت،محبت اور کاوشوں سے ادبی دنیا میں قدم رکھا تھا۔

سروری کسانہ گوجری ادب میں ایک اونچا مقام رکھتے ہیں۔جنھوں نے ناول نگار کے متعلق ایک مضمون لکھا ہے،جس سے ہم یہ اندازا لگا سکتے ہیں کہ مصنف کا گوجری ادب میں بحیثیت ناول نگار کیا رُتبہ ہے؟ لکھتے ہیں کہ:

''اصغر صاحب مہارا ملک تے ریاست جموں کشمیر کا پہلا گوجری ادیب ہیں جن نوں پہلو گوجری ناول سرجن کو کریڈٹ جا۔یہ گوجری زبان کی گودنوں اپنی ادبی سرجان سنگ بھرن کو حوصلو رکھیں۔''(آخری سہارو،صفحہ 04،اشاعت1989)

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوا کہ گوجری ناول میں غلام رسول اصغر گوجری کے پہلے ناول نگار ہیں اور انکا لکھا ہوا''آخری سہارو'' گوجری کا پہلا ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔اس بات میں کسی کو کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔اسی بات کی تصدیق کرتے ہوڈاکٹر ارشد کسانہ لکھتے ہیں:

" گوجری کو پہلو ناول غلام رسول اصغر کو''آخری سہارو''1990ء ماباندے آیوتھو۔اصغر

صاحب نے گوجری ماناول کی بنیاد رکھ چھوڑی لیکن اس توں بعد اس بنیاد پر اک ردو وی نہیں لکھو۔نہ کو دوجو ناول باندے آیو تے نہ کسے نے ''آخری سہارو'' ور کوگل کی۔اس را لگے جس را کسے نے پڑھیو ہی نہ وے۔'' (ڈار کی واپسی،صفحہ 07،اشاعت 2024ء)

اس اقتباس سے گوجری ناول کی ابتداء وارتقاء کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ گوجری کا پہلا ناول نگار غلام رسول اصغر جنھوں نے گوجری کا پہلا ناول" آخری سہارو" لکھ کر گوجری ناول کی بنیاد تو رکھی لیکن اس کے بعد ایک طویل مدت گوجری ناول کا میدان ویران دکھائی دیتا ہے۔ اکیسویں صدی کے شروعات میں گوجری ناول کا ارتقاء سفر شروع ہوتا ہے،جن میں کچھ تراجم کیئے ہوئے ناول مثلاً " بیوہ" مترجم حسن پرواز (2009)،''اک کھوتا کی آپ برتی'' مترجم حسن پرواز (2009)، " تتی چھاں" مترجم عبدالمجید حسرت (2019) اور" دردانہ" مترجم ڈاکٹر مختار احمد (2023) کے نام قابل ذکر ہیں لیکن غلام رسول اصغر کے بعد طبع زاد ناول لکھنے والا دوسرا ناول نگار ڈاکٹر ارشد کسانہ کا نام آتا ہے۔جنھوں نے" ڈار کی واپسی" کے نام سے گوجری ناول لکھ کر سال 2024ء میں گوجری ناول کے ارتقائی سفر میں مزید اضافہ کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔،موصوف کی اس کوشش کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

گوجری ناول کا ارتقاء: بیسویں صدی میں جہاں گوجری ناول کے ابتدائی اور ارتقائی سفر میں تاخیر ہوئی ہے وہاں اکیسویں صدی کے شروعات میں تیزی بھی دکھائی دیتی ہے۔جن میں ڈاکٹر ارشد کسانہ کا ناول''ڈار کی واپسی'' اور جاوید سحر کا ناول''نوری'' طبع زاد ہیں،ان کے علاوہ کئی مترجمین کے تراجم کیے ہوئے ناول گوجری افسانوی ادب کے ارتقائی سفر میں سونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔جن کو یکے بعد دیگرے کے طور پر مختصراً تعارف پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

غلام رسول اصغر کا ناول" آخری سہارو" گوجری ناول میں اولین درجہ رکھتا ہے لیکن اس کے بعد تراجم کیے ہوئے کئی ناول نظر آتے ہیں مگر گوجری میں طبع زاد دوسرا ناول ڈاکٹر ارشد کسانہ کا''ڈار کی واپسی'' شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔جس کی سن اشاعت سال 2024ء ہے۔ اس کے متعلق محمد فرید راز لکھتے ہیں کہ: "ڈار کی واپسی'' گوجری زبان وادب کو دوجو ناول ہے۔گوجری زبان و ادب کی چھولی ماسلکھنو باہدو ہے،اس کامیاب کوشش پر ارشد کسانہ ہوراں نا میری طرفوں مبارک باد۔یوہ تاریخی ناول ہے۔۔۔۔۔گوجری زبان وادب کی چھولی

مااس ناول نال سلکھنو باہدو ہو یو ہے۔اس واسطے ہوں ڈاکٹر ارشد کسانہ ہوراں نا مبار کباد پیش کروں۔'' (ڈار کی واپسی ،صفحہ 15،سن اشاعت 2024ء)

مزکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گوجری ادب میں دوسرا ناول ''ڈار کی واپسی'' اور دوسرا ناول نگار ڈاکٹر ارشد کسانہ ہیں۔ یہ ناول طبع زاد ہے۔ارشد کسانہ کا گوجری ادب میں ایک اونچا مقام ہے۔وہ نہ صرف گوجری کے ادیب ہیں بلکہ انھیں گوجری کا استاذ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔موصوف کا پہلا ناول" کہیں تو سحر ہوگی" اردو زبان میں سال 2022ء میں شائع ہوااور دوسرا ناول" ڈار کی واپسی" نہ صرف موصوف کا بلکہ گوجری کا بھی دوسرا طبع زاد ناول ہے،جس کی اشاعت 2024ء میں ہوئی۔ یہ ان کا افسانوی ادب سے دلچسپی کا ثبوت نظر آتا ہے۔جنھوں نے اتنی کم عمر،کم وقت اور تعلیمی مصروفیات کے دوران ادب تخلیق کرنے میں مصروف رہے یہ ان کی بہترین صلاحیت،قابلیت اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

گوجری ناول کے ارتقاء میں ایک اور ناول نگار جاوید سحر کا نام آتا ہے،جنھوں نے " نوری" ناول لکھ کر گوجری ناول کے میدان میں اضافہ کیا ہے۔اس ناول کی کہانی سوشل میڈیا پر دستیاب ہے۔نوری ناول کی سن اشاعت رانا ابرار کے مطابق سال 2026ء ہے۔۔۔۔، یہ ناول میری نگاہوں سے ابھی اوجھل ہے لیکن اس ناول کے متعلق رانا ابرار لکھتے ہیں کہ:

''میں عالمی ادب کا سارا شاہکار ناول ایک زمانہ ما پڑھیا ہیں ورنوری نا پڑھ گے مناں لگو کہ کسراں کسے کہانی نا جیو جا سکے یوہ محول زبان تے آپتی احساس کو چکر تھو۔جس کو پہلی بار تجربو ہوؤ تے اس ناول نے مناں بلئیں باسیں روائیو۔''

اس ناول کے متعلق مذید کچھ کہنا اس لیے بھی مناسب نہیں کیونکہ یہ میرے پاس دستیاب نہیں البتہ سوشل میڈیا پر نوری ناول کی کہانی سننے میں بہترین گوجری الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔۔اس کے علاوہ رانا ابرار کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ گوجری ادب میں نوری ناول کا بہت بڑا مقام ہے جس میں گوجری تہذیب کی بُو ملتی ہے۔تحقیق کے مطابق گوجری طبع زاد ناولوں میں ''نوری'' تیسرا ناول ہے،جس کا تخلیق کار جاوید سحر ہے۔گوجری ترجمہ نگاری کے حوالے سے حسن پرواز کا بہت بڑا کردار ہے۔جنھوں نے گوجری میں دو ناولوں کا تراجم کر کے گوجری ادب کے افسانوی ادب کو ترقی بخشی ہے۔انھوں نے منشی پریم چند کا ''بیوہ'' اور کرشن چندر کا ''اک

کھوتا کی آپ بِرتی'' ناولوں کا گوجری میں ترجمہ کر کے گوجری ناول کے ارتقائی سفر کو عروج بخشا ہے۔اگر غور کیا جائے تو تخلیق سے ترجمہ مشکل فن ہے۔ایک زبان اور تہذیب کو دوسری زبان میں منتقل کرنا کوئی معمولی یا سہل کام نہیں بلکہ بہترین تقابلی سوچ اور دونوں زبانوں کے بہترین الفاظ کی ترتیب پر مہارت ہونا لازمی ہے۔ گوجری ترجمہ کے حوالے سے حسن پرواز بڑی شخصیت کے مالک ہیں۔ڈاکٹر جاوید راہی لکھتے ہیں کہ: ''پریم چند کا ناول اک تیں بدھ کے اک ہیں تے ان سب ماں اُس سماج کی گل لبھیں جس ماں ہم تم بس رہیا ہاں۔ انھاں نا پڑھن سنگ اسطرح سہی ہووے جے یہ مھاراہی سماج کی گل دوجاں کا مُنہ بچوں اُن کی بولی ماں نکل رہی ہیں۔لہذا مھاری یاہ کوشش ہے جے یہ ساری گل تھارا توڑی اپنی بولی ماں پچائی جائیں۔ پریم چند کو ناول ''بیوہ'' اک اِسا سماج کی کہانی ہے جس ماں سخت قضیاں بھری زندگی کی اوکھتاں کو ذکر ہے۔' (بیوہ ناول، حسن پرواز، ص03 اور 04، ع2009)

بالا اقتباس کے ذریعے پریم چند کے کئی ناول ہمارے سماج کے عکاس ہیں جن میں سے ''بیوہ'' ناول کو ترجمہ کے ذریعے حسن پرواز نے گوجری زبان میں منتقل کر کے جہاں عام لوگوں کو آشنا کرنے میں آسانی بخشی، وہاں گوجری زبان و ادب کی خدمات میں بھی سرفہرست کا مقام حاصل کیا۔موصوف نے کرشن چندر کا ناول ''ایک گدھے کی سرگذشت'' کو گوجری میں ''اک کھوتا کی آپ بِرتی'' کے نام سے ترجمہ کیا۔اسی متعلق ڈاکٹر جاوید راہی لکھتے ہیں کہ:

''کرشن چندر کا اردو ناول ''ایک گدھے کی سرگذشت'' کو گوجری ترجمو ''اک کھوتا کی آپ بِرتی'' بھی تم نا یقیناً پسند آوے گو۔خالص گوجرا الفاظ کو برتون ماں حسن پرواز اک نمیکلو مقام رکھیں تے گوجری کا بُھلتا جار ہیا الفاظ کی برتون سنگ مھاری آتی نسل نا ضرور فائدو پُجے گو۔''

(اک کھوتا کی آپ بِرتی، حسن پرواز، ص06، ع2009ء)

حسن پرواز نے ''بیوہ'' اور ''اک کھوتا کی آپ بِرتی'' نام کے دو ناولوں کا تراجم کر کے گوجری افسانوی ادب کی صنفِ ناول کو عروج بخشا ہے۔ ان دونوں ناولوں کی سن اشاعت گوجری زبان کے پہناوے کے مطابق سال 2009ء ہے۔ جو ریاستی کلچرل اکیڈیمی سے چھپ کر گوجری زبان و ادب میں آضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ناول موضوع کے اعتبار سے ہمارے سماج کے عکاس ہیں۔اس کے بعد عبدالمجید حسرت کا نام آتا ہے جنھوں نے پرویز

مانوس کا پہاڑی ناول ''تتی چھاں'' کو گوجری میں ترجمہ کر کے گوجری ناول کے ارتقائی سفر کو مضبوط کیا۔ان کا یہ ناول ریاستی کلچرل اکیڈیمی کی زیر نگرانی میں سال2019ء میں شائع ہوا۔ عبدالمجید حسرت لکھتے ہیں کہ: "موضوع تے ماحول کا لحاظ نال یوہ ناول (تتی چھاں) پہاڑی تے گوجری ثقافت کی سانجھ کی عکاسی بھی کرے جت شہر کی فضا اس ناول ماں دیکھی جاؤ تے گراں کی مٹی کی خوشبو تے گوجری ثقافت کی بو باس بھی محسوس کی جا سکے۔''

(تتی چھاں،عبدالمجید حسرت،ص05،ع2019)

مذکورہ بالا اقتباس میں موصوف نے جو اس ناول کے متعلق لکھا وہ حقیقتاً درست ہے کیونکہ گوجری اور پہاڑی زبان بولنے والوں کا تہذیب،ثقافت اور زبان کے الفاظ میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔موصوف نے اس ناول (تتی چھاں) کو پہاڑی سے گوجری زبان میں منتقل کرنے میں اپنی محنت،محبت اور ادبی شوق کا ثبوت دیا ہے۔حسرت ایک بہترین اردو،گوجری اور پہاڑی کے قلمکار ہیں۔انھوں نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں لیکن جو کوشش ترجمہ میں کی ہے وہ ان کی شہرت کو مزید ترقی بخش ہے۔اس کے بعد دیپک کنول کا دردانہ ناول کا گوجری میں ترجمہ ڈاکٹر مختار احمد نے سال2023ء میں کیا۔جس کے متعلق ڈاکٹر ارشد کسانہ لکھتے ہیں کہ:

"دیپک کنول کو ناول ''دردانہ'' اردو توں گوجری ما ترجمہ کیو ہے لیکن اس کے پچھے خاصی محنت تے جذبہ کی ضرورت ہوے۔انھاں نے ان دواں چیزاں کولوں کم لیو تے اپنی کوشش کامیاب کی۔ (دردانہ،مترجم ڈاکٹر مختار احمد،ص05،ع2023ء)

ڈاکٹر مختار احمد نے دردانہ ناول کو اردو سے گوجری میں منتقل کیا۔ان کی یہ کاوش گوجری ناول کے ارتقاء میں بہترین کارکردگی کا ثبوت نظر آتا ہے۔ڈاکٹر ارشد کسانہ نے اپنی تحریر میں وضاحت کی ہے کہ دردانہ ناول کا موضوع گوجرا ماحول سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے۔اس غرض سے بھی اس ناول کا ترجمہ گوجری ادب میں کافی اہم مقبولیت کا سبب بنتا ہے۔ان کے بعد نوجوان قلمکار محمد فرید راز کا نام آتا ہے جو ڈاکٹر ارشد کے اردو ناول ''کہیں تو سحر ہوگی'' اس کو گوجری میں "کدے تے سویروے گی"اس نام سے ترجمہ کرنے میں مصروف ہیں۔اُمید ہے کہ یہ ناول بھی جلد مکمل ہو کر گوجری صنفِ ناول کے ارتقائی سفر میں آضافے کی مانند ثابت ہوگا۔

مختصر الفاظ میں یہ کہ گوجری ناول کی ابتداء چودھری غلام رسول اصغر نے سال

1989ء میں" آخری سہارو" کے نام سے ناول لکھ کر کی ،مگر ایک عرصہ یہ صنف دوسرے ناول کی انتظار کرتی رہی جس کے بعد حسن پرواز کے دو ناول ''بیوہ'' اور''اک کھوتا کی آپ بِرتی'' سال 2009ء میں ترجمہ کے ذریعے گوجری میں داخل ہو۔۔ پھر عبدالمجید حسرت نے پہاڑی ناول ''تتی چھاں'' کا گوجری ترجمہ سال 2019ء میں کیا، ڈاکٹر مختار احمد نے دردانہ ناول کا گوجری ترجمہ سال 2023ء میں کیا۔ اسطرح ترجمہ کے ذریعے گوجری ناول کے ارتقائی سفر کی شروعات ہوتی ہے اور کئی سالوں کے بعد ڈاکٹر ارشد کسانہ کا طبع زاد گوجری کا دوسرا ناول ''ڈار کی واپسی'' کے نام سے سال 2024ء میں منظر عام پر آیا اور جاوید سحر کا ناول ''نوری'' بھی طبع زاد ہے جو آخری مراحل سے گزر رہا ہے انشاءاللہ وہ بھی جلد قارئین کے سامنے آئے گا۔ خاص بات یہ کہ گوجری ناول میں مترجمین کا بہت بڑا کردار رہا ہے جنھوں نے گوجری صنفِ ناول کو مزید ترقی اور عروج بخشنے میں کافی تعاون پیش کیا ہے، جن کے نام کبھی بھی نظر انداز یا فراموش نہیں کیے جا سکتے یہ کارواں ابھی بھی جاری ہے جن میں محمد فرید راز کا اردو سے گوجری میں ''کدے تے سویروے گی'' یہ ناول بھی آخری مراحل سے گزر رہا ہے اُمید کی جا سکتی ہے کہ یہ ناول بھی جلد منظر عام پر آئے گا۔ اسطرح نہ صرف سویر ہو گی بلکہ دن میں سورج اور رات میں چاندنی کی طرح یہ صنف بھی گردش کرتی دکھائی دے گی۔۔۔۔۔، گوجری ادباء کی کاوشوں سے یہ صنف بھی ترقی کرتے کرتے انشاءاللہ بامِ عروج پر پہونچے گی۔

کتابیات: 01) آخری سہارو، چودھری غلام رسول اصغر، 1989ء
02) ڈار کی واپسی، ڈاکٹر ارشد کسانہ، 2024ء
03) بیوہ، حسن پرواز، 2009ء
04) ایک کھوتا کی آپ برتی، حسن پرواز، 2009ء
05) تتی چھاں، عبدالمجید حسرت، 2019ء
06) دردانہ، ڈاکٹر مختار احمد، 2023ء
07) گوجری نثریات، ڈاکٹر رفیق انجم، 2020ء
08) دوحرف، عبداللطیف بجران، 2021ء

☆☆☆

Parvin Shakir ki Shairi "Maah-e-Tamam" ke Aaine mein by

Dr. Mahjabeen(Asst. Prof. Dept. of Urdu T.D.B. College, Raniganj,

Paschim Burdwan) cell-9748003032

ڈاکٹر مہ جبیں (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہء اردو، ٹی۔ڈی۔بی۔کالج، رانی گنج)

پروین شاکر کی شاعری ماہِ تمام کے آئینے میں

''اور میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک ایسے قبیلے میں پیدا ہوئی جہاں سوچ رکھنا جرائم میں شامل ہے، مگر قبیلے والوں سے بھول یہ ہوئی کہ انہوں نے مجھے پیدا ہوتے ہی زمین میں نہیں گاڑ ا (اور اب مجھے دیوار میں چن دینا ان کے لئے اخلاقی طور پر اتنا آسان نہیں رہا) مگر وہ اپنی بھول سے بے خبر نہیں، سو اب میں ہوں اور ہونے کی مجبوری کا یہ اندھا کنواں جس کے گرد گھومتے گھومتے میرے پاؤں پتھر کے ہو گئے ہیں اور آنکھیں پانی کی۔۔۔۔۔۔ کیونکہ میں نے اورلڑکیوں کی طرح کھوپے پہننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور انکار کرنے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا'' (کلیات ماہ تمام۔ پروین شاکر۔صفحہ ۱۳۔ ۱۹۹۵ء)

پروین شاکر کے دوسرے مجموعۂ کلام ''صد برگ" میں تحریر یہ اقتباس صاف طور پر اس بات کی گواہی دیا ہے کہ وہ ایک بلند خیال شاعرہ ہیں۔ جنہیں زمانے کی تابیداری قبول نہیں، وہ ایک ایسی خاتون ہیں جنہیں رسم ورواج، زمانے کی ستائش، توہم پرستی اور خاص کر عورتوں پر پابندی برداشت نہیں۔ وہ ہر قید سے آزاد کھلی فضا میں رہنا پسند کرتی ہیں۔ ان کا تخیل بلند پرواز ہے۔ یہی تخیلی دراصل شاعری کا روپ بدل کر منظر عام پر آیا اور انہیں ایک ممتاز سخنور بنا دیا۔ پروین شاکم شاعری کی ہیئت، میلانات، رجحانات اور اسلوب آہنگ سے پوری طرح واقف تھیں۔ اس لئے وہ اپنے اولین شعری مجموعہ ''خوشبو'' کے دیباچے میں اس بات کو کچھ اسطرح سے واضح کرتی ہیں:

''وجود کو جب محبت کا وجدان ملا تو شاعری نے جنم لیا۔ اس کا آہنگ وہی ہے جو موسیقی کا ہے۔

جب تک سارے شعر سچے نہ لگیں گلے میں نور نہیں آتا! دل کے سب زخم لو نہ دیں تو حرف میں روشنی نہیں آتی'' (کلیات ماہ تمام۔ پروین شاکر۔صفحہ ۱۸)

''خوشبو'' کے عنوان سے پہلا شعری مجموعہ ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آیا۔خوشبو اس طرح بکھری کہ لوگوں کا ذہن معطر ہو گیا۔ یہ خوشبوئے گل صد برگ کی بہار بن کر ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آئی۔ بہار کے بعد پت جھڑ نے اپنا رنگ دیکھا یا تو تنہائی کا عالم ''خود کلامی'' کی شکل لئے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ پھر نا انصافی اور آپسی تکرار حد سے بڑھ گئی تو ۱۹۹۰ء میں ''انکار'' کی اشاعت ہوئی۔ پروین شاکر کا پہلا مجموعہ عنفوانِ شباب یعنی نسوانی جذبات اور الڑھ،شوخ جوانی کے مشاہدات واقعات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے جلوہ افروز ہوا۔جس میں شاعرانہ لب و لہجہ، بے باک انداز اور ایک نوجوان لڑکی کے رومانی جذبات کی عکاسی بڑی خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔ پروین شاکر کہتی ہیں:

''محبت جب تقاضائے جسم و جان سے ماوراء ہو جائے ہے تو الہام بن جاتی ہے۔۔۔۔۔حسن جب لطافت کی آخری حدوں کو چھو لے تو خوشبو بن جاتا ہے۔'' (ایضاً،صفحہ ۱۹۔ ۱۹۹۵ء)

شاعری ایک پیچیدہ تجربہ ہے۔جس میں آسودگی کی مختلف ملی جلی شکلیں ہوتی ہیں۔ یہ پڑھنے والے پر منحصر ہوتا کہ ہے کہ وہ اسے کسی طرح قبول کرے۔ کیونکہ ہر انسان کی خصلتیں، چاہتیں، جذبات واحساسات مختلف ہوتے ہیں۔مگر عنفوان شباب زندگی کا وہ پڑاؤ ہے جس میں ہر کسی پر محبت کا رنگ چڑھتا ہے۔لیکن ہمارا سماج لڑکی کی محبت کو جرم قرار دیتا ہے۔ پروین شاکر اس جرم کو بڑے فخر کے ساتھ قبول کرتی ہیں۔ اور جذبات کی رو میں بہنے کے بجائے پوری چابک دستی کے ساتھ اس پر قابو رکھتی ہیں۔ اپنی نظم پرزم (PRISM) کے کچھ مصرعے میں نفسیاتی احساس کی وضاحت بڑے خوبصورت انداز میں کرتی نظر آتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

میرا بھی ایک سورج ہے۔\
جو میرا تن چھو کر مجھ میں\
قوس قزح کے پھول اگائے\
ذرا بھی اس نے زاویہ بدلا

اور میں ہوگئی
پانی کا اک سادہ قطرہ
بے منظر بے رنگ'' (پرنم، کلیات ماہِ تمام۔ پروین شاکر۔صفحہ ۴۰۔ ۱۹۹۵ء)

پروین شاکر نے عورتوں کے جذبات، احساسات اور کیفیات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ماقبل اور مابعد کے نفسیاتی احساسات کو جس خوبی سے عیاں کرتی ہیں اس کا اظہار کسی اور شاعرہ کے یہاں دیکھنے کو کم ہی ملتا ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ مرد اساس معاشرے میں ایک عورت کا اظہار خیال کرنا دراصل گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ جیسے ہی اس کے ہونٹوں سے نکل کر یہ بات منظر عام پر آئے گی دنیا والے سنگ بازی سے اس کا جینا دشوار کر دیں گے۔ تمام باتیں جاننے کے باوجود وہ جذبات میں تخیل کا پر لگائے پرواز کرتی ہیں۔ گویا اس دنیا کی طعنہ کشی کا ان پر کوئی اثر نہیں۔ ان کی نظم ''اعتراف'' جذبات نگاری کی بہترین مثال ہے۔

''جانے کب تک تری تصویر نگاہوں میں رہی
ہو گئی رات ترے عکس کو تکتے تکتے
میں نے پھر تیرے تصور کے کسی لمحے میں
تیری تصویر پہ لب رکھ دیے آہستہ سے!''
(اعتراف، کلیات ماہ تمام۔ پروین شاکر۔صفحہ ۲۹۔ ۱۹۹۵ء)

پروین شاکر کی شاعری کے دوسرے مجموعے کے دیباچے میں جو بات کہی گئی ہے اس سے اداسی، نا امیدی، ذہنی کرب بے چینی اور تنہائی کا علم ہوتا ہے۔ ''صد برگ'' کی پہلی غزل کا پہلا مصرعہ اس بات کا اعتراف بھی کرتا ہے شعر ملاحظ فرمائیں:

جلا دیا شجر جاں کہ سبز بخت نہ تھا کسی بھی رت میں ہرا ہو یہ وہ درخت نہ تھا (مطلع)
وہ خواب دیکھا تھا شہزادیوں نے پچھلے پہر
کہ اُس کے بعد مقدر میں تاج وتخت نہ تھا (حسن مطلع)

پروین شاکر کی شاعری میں جدیدیت کا عکس نسوانی دائرے کو عبور کرتا ہوا نمایاں ہوتا ہے۔ ذاتی کرب اور سماجی مسائل دراصل یکجا ہو کر ان کی شاعری کا حصہ بنے۔ وہ ایک ایسی شخصیت کی مالک تھی جو زمانے کی روش سے انحراف کرتے ہوئے اپنا راستہ خود بنانا چاہتی

تھیں۔انہیں یہ بھی احساس تھا کہ وہ ایک عورت ہیں ۔اورعورت ہونے کا خمیازہ دنیا کی کام عورتوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔اس (Male Dominated) دنیا میں کسی عورت یا لڑکی کا کسی روایت کے خلاف (انکار) بغاوت کرنا ایک بڑے جرم سے کم نہ تھا۔جس کی سزا شاید موت سے بھی بدتر ہو۔اس لئے وہ کہتی ہیں:

''ہر انکار پر میرے جسم میں ایک میخ کا اوراضافہ ہوگیا۔۔۔۔۔۔۔مگر میخیں ٹھوکنے والوں نے میری آنکھوں سے کوئی تعرض نہ کیا۔۔۔۔۔۔۔۔شاید وہ جانتے تھے کہ انھیں بجھانے سے میرے اندر کی روشنی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، یا پھر اپنی شفا کیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہ ایک گونگے گواہ کے طالب تھے اور میں حیران ہوں کہ اس گواہی سے میری آنکھیں اب تک پتھرائی کیوں نہیں!'' (کلیات ماہِ تمام۔پروین شاکر۔صفحہ ۱۳۔۱۹۹۵ء)

سچ تو یہ ہے کہ شاعری میں پروین شاکر کا اپنا ایک الگ انداز ہے اور یہ انداز انسانی زندگی کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ سیاسی،سماجی،معاشی اور خصوصاً پاکستان کا المیہ بھی بن کر ابھرتا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری میں اجتماعی ماحول کی تکلیف، یاسیت، ناامیدی، جبر و استحصال، بے گناہ معصوم، بےقصور، بے یارومددگار لوگوں کی پریشانیوں،شہر میں ہونے والی تباہی کی بہترین ترجمان نظم ''کراچی ۱۹۸۹ء کی آخری شام'' کافی اہمیت کی حامل ہے۔

عکس گل تر جلا ہوا تھا
خوابوں کا نگر جلا ہوا تھا
یا دست دعا نہ اٹھ سکا تھا
یا اس کا اثر جلا ہوا تھا
ہر گھر تھا لٹا ہوا کئی بار
اور بارِ دگر گلا ہوا تھا
یا نوچ لئے گئے تھے پتے
یا سارا شجر جلا ہوا تھا
آنکھوں کی جگہ پر آبلے تھے
اور تار نظر جلا ہوا تھا

(کلیات ماہ تمام۔ پروین شاکر۔صفحہ ۱۴۵)

پروین شاکر نے طوائف الملوکی کا ذکر صرف نظموں ہی میں نہیں کیا بلکہ غزلوں میں بھی اس کا عکس نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کہاں سے آتی کرن زندگی کے زنداں میں وہ گھر ملا تھا مجھے جس میں کوئی در ہی نہ تھا
مشکل ہے کہ اب شہر سے نکلے کوئی گھر سے دستار پہ بات آ گئی ہوتی ہوئی سر سے
رونق بازار وہ محل کم نہیں ہے آج بھی سانحہ اس شہر میں کوئی مگر ہونے کو ہے

(کلیات ماہ تمام۔ پروین شاکر۔صفحہ ۱۰۸)

پروین شاکر کی شاعری کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے چھوٹی بحروں کا خصوصاً استعمال کیا ہے۔ مانوس الفاظ، عام بول چال کی زبان و انداز کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ''سہل ممتنع'' ان کی شاعری کی پہچان ہے۔

پروین شاکر کی مزید دو دوسرے مجموعہ کلام یعنی ''خود کلامی'' اور ''انکار'' میں بھی درد، کسک، زندگی سے ناامیدی، بکھرے ہوئے جذبات، خوش گوار لمحوں کی یادیں، گذشتہ باتیں احساس کے آئینے میں دھندلے عکس کے مانند نظر آتے ہیں۔ وہ چاہ کر بھی ان لمحات کو واپس نہیں لا سکتیں کیونکہ وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ گزرا ہوا وقت کبھی واپس نہیں آ سکتا۔ وہ بس احساسات و جذبات ہی ہوتے ہیں جو ذہن و دل کے مختلف خانوں میں محفوظ ہوتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تیری خوش نامی کا آتا ہے بہت دل کو خیال گریہ کرتے ہوئے آواز اگر کھینچتے ہیں
جب کبھی خوبیٔ قسمت سے تجھے دیکھتے ہیں آئینہ خانے کی حیرت سے تجھے دیکھتے ہیں
کاسۂ دید میں بس ایک جھلک کا سکہ ہم فقیروں کی قناعت سے تجھے دیکھتے ہیں

پروین شاکر کی شاعری کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے آسان، سادہ، سلیس اردو اور ہندی زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی لفظوں کا چلن بھی عام کرتی ہیں۔ یعنی انگریزی الفاظ بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس طرح تحریر کرتی ہیں کہ پڑھنے اور سننے میں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتا۔ بھلے گزشتہ زمانے میں ہم انگریزوں سے نفرت کرتے ہوں یا اکبرالہٰ آبادی جیسا شاعر انگریزی کے لفظوں کو اپنی شاعری میں حربہ و ہتھیار کے طور پر استعمال کیا کرتے ہوں مگر سچ تو یہ

ہے کہ اب انگریزی زبان ہمارے لئے فیشن اور ضرورت دونوں بن چکی ہے۔اس لئے ہم اس ملی جلی کلچر کونظر انداز نہیں کر سکتے۔ پروین شاکر کے یہاں بھی یہ کلچر ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔نظم ''ویسٹ لینڈ'' لیکن نظم ویست لینڈ انہوں نے الیٹ کی مشہور نظم Weste Land سے متاثر ہو کر کہتی ہیں۔اس کے علاوہ ڈیوٹی،،ہنی مون، نیک نیم، اسٹینوگرافر، والنگ وومن A Womens Pride ،لیڈی آف دی ہاؤس Demonetization ،پوسٹ ڈیز آئیٹم، چیین دی ایکش، دی مسنگ لنک، ٹماٹو کیچپ I'll Miss You وغیرہ نظموں کے عنوان خالص انگریزی میں ہیں مگر پروین شاکر کی یہ خوبی ہے کہ ان الفاظوں کو اردو کے ساتھ برتنے میں کوئی ناانصافی نہیں کرتی۔

پروین شاکر کی شاعری میں جدیدیت کی صدا بھی سنائی دیتی ہے۔بھیڑ میں وہ رہ کر تنہا ہونے کا احساس، ہمیشہ ان کے اندر موجود رہا۔ ذہنی کش مکش، بے چینی، مایوسی، انسانی رشتوں کے تقاضے اور اخلاقی گراوٹ دراصل جدیدیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔اس لئے ان کی شاعری جدید شاعری کے زمرے میں پوری طرح سے اترتی ہے۔غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ابھی تک بھائیوں میں دشمنی تھی یہ ماں کے خون کا پیاسا ہو گیا کون
نہ جانے کون سا آسیب دل میں بستا ہے کہ جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا
ہم آج بھی مجھے سوتے ہیں ڈسنے آئے گا وہ جانتا ہے کہ کھلتا ہے مجھ پہ زہر کا رنگ
اک غم سے زندگی کا معمول تنہائی ہے اور خود کلامی
خود اپنے سے ملنے کا تو یارانہ تھا مجھ میں میں بھیڑ میں گم ہو گئی تنہائی کے ڈر سے

نعت کی اسلوب نگارش میں جدید ہیتی تجربات کئے جا رہے ہیں۔ یہ ہیتی تجربے کا نمونہ پروین شاکر کی نظم ''وحی'' میں بھی نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ مذہبی عقیدت کا اظہار قطع شام غریباں، علی مشکل کشا سے اور واوف بعیدِ ک (جو امام حسین کی زبان پر شہادت کے وقت کا آخری جملہ) کو آزاد نظم کے ذریعہ خراج عقدت پیش کرتی ہیں۔نظم ''وحی'' عقیدت واحترام کا رنگ وآہنگ اپنے اندر سمیٹے ہوئے نئی ہیتی تجربے کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔نعت ''وحی'' کا یہ ٹکڑا بطور مثال پیش ہے۔

فضائے بے نطق جیسے اقراء کا ورد کرنے لگی تھیں
وہ سارے لئے لفظ جو
تیرگی کے سیلاب میں کہیں بہہ چکے تھے
پھر روشنی کی لہروں میں
واپسی کے سفر کا آغاز کر رہے تھے
دریچہ بے خیال میں
آگہی کے سورج اتر رہے تھے!
اس ایک پل میں
وہ میرا امتی
مدینۃ العلم بن چکا تھا۔''
(ماہ تمام۔ پروین شاکر۔صفحہ ۲۰۵۔(خوشتو)

پروین شاکر کی کلیات ''ماہ تمام'' میں ۲۵ بڑی نظمیں بھی موجود ہیں۔جن پر مختلف طرح کے اعتراضات بھی ہوئے۔ خاصکر ان کی نظم ''بشیرے کی گھر والی'' پر لوگوں نے تو اعتراضات کے تیر برسانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھورا۔دراصل یہ ایک نثری طنزیہ نظم ہے۔ جو عورتوں کے جذبات و احساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ایک عورت جیسے دودھ پلانے والے جانوروں میں افضلیت حاصل ہے۔اللہ نے اس کی پیدائش مرد کی پسلی سے کی ہے۔ پھر وہ ماں کا آنچل تھامے کبھی اپلے بناتی ہے تو کبھی لکڑیاں کاٹتی ہے۔تو کبھی گائے کو چارا دیتی مگر اسے کھانے میں وہی باسی روٹی، پہنے کو موٹا کپڑا اور جب جوان ہوتی ہے تو باپ کی نفرت بھری نگاہ اسے اوپر سے نیچے تک تاڑتی ہے۔ پھر سن بلوغت میں کسی مرد کے سر یہ بوجھ ڈال دی جاتی ہے۔ پھر یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔بس اس کی نوکری میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے اور اب اسے پیڑ کے نیچے کڑی دھوپ میں لمحہ بھر کے لئے ستانے کا موقع نہیں ملتا۔اے عورت تجھے کن کرموں کا پھل مل رکھا ہے؟ پروین شاکر دنیا کے تمام لوگوں سے یہ سوال کرتی ہیں کہ کیا صرف ایک روٹی اور ایک گھونٹ پانی کی خاطر یہ سلسلہ دراز یونہی چلتا رہے گا؟ کیا صرف عورت ہی بلیدان کی خاطر پیدا ہوئی ہے؟ کیا ایک عورت کا وجود خود اس کے لئے کوئی معنی بھی رکھتا ہے

یا نہیں؟ مثال کے طور نظم کا یہ ٹکڑا دیکھئے:

کن کرموں کا پھل ہے تو
تن بیچے تو بھی کسی ٹھہرے
من کا سودا کرے اور پتنی کہلائے
سمے کے ہاتھوں ہوتا رہے گا
کب تک یہ اتمان
ایک نوالہ روٹی
ایک کٹورے پانی کی خاطر
دیتی رہے گی کب تک تو بلیدان

(کلیات ماہ تمام۔ پروین شاکر۔صفحہ ۱۵۵۔''انکار'')

اس طرح کی نظمیں پروین شاکر کی شناخت بن گئی ہیں۔ جن میں عورت کے جذبات واحساسات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ پروین شاکر کی شاعری میں ایک اور بات جو بڑے صاف ستھرے انداز میں ہمارے سامنے آتی وہ ہندی لفظوں کا استعمال ہے۔ انہوں نے ہندی کے الفاظ جگہ جگہ مناسب موقع کو تلاش کر کے اس طرح ثبت کرتی ہیں کہ وہ بے جا یا فضول معلوم نہیں ہوتے۔ یہ شاید ہندوستان سے نسبت کا اثر ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۸ء کے اواخر میں ہندوستان آئی تھیں اور جاتے جاتے یہاں کی محبت، خلوص، چاہت اپنے ساتھ سمیٹ کر لے گئی تھیں۔ اس کا مظاہرہ ان کی کئی مشہور نظموں میں نظر آتا ہے جیسے تاج محل، فراق گورکھپوری اور قرۃ العین حید، گنگا سے، اے جگ کے رنگ ریز (امیر خرد) اور سلمیٰ کرشن وغیر وغیرہ۔ نظم ''تاج محل'' کا یہ بند بطور مثال پیش ہے:

کیا عجیب نیند ہے
جس کو چھو کر
جو بھی آتا ہے کھلی آنکھ لیے آتا ہے
سو چکے خواب ابد دیکھنے والے کب تک
اور زمانہ ہے کہ اس خواب کی تعبیر لیے جاگ رہا ہے

اب تک

(تاج محل)

پروین شاکر قرۃ العین حیدر کو خط کے ذریعہ اپنے تاثرات کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتی ہیں۔ بقول پروین شاکر:

''ہندوستان سے واپسی کے بعد جب ذہن سے سفر کی گرد اترتی تو سونے کے کچھ ذرات میری سوچ کی انگلیوں پر لگے رہ گئے۔ تاج محل، گنگا سے، اے جگ کے رنگ ریز (امیر خسرو) بو یاسمین باقیت، قرۃ العین حیدر اور سلمٰی کرشن۔ یہ میری نظمیں ہیں جو اس سفر کا عطیہ ہیں۔''

(اردو چینل۔قمر صدیقی۔مضمون رووف خیر۔صفحہ ۱۳۰۔سنہ ۱۹۹۸ء)

پروین شاکر اپنی شاعری میں جذبات، احساسات، معاشرتی واقعات اور زندگی کا سانحہ شعر کے وسیلے سے پیش کرنے کے لئے اکثر و بیشتر علامتوں تو کبھی استعاروں کا سہارا لیتی ہیں۔ جیسے نجم، خنجم، بادل، چہرہ، بدن، زخم، پھول، خوشبو، طاؤس، تتلیاں، رقص، بھنور وغیرہ جیسے الفاظ اپنے پورے حسن و معنویت کے ساتھ ان کیفیات کی عکاسی کرتی ہیں۔ پروین شاکر ایک ایسی خاتون شاعرہ ہیں جنہوں نے اپنے منفرد انداز و اسلوب بیاں کے ذریعہ لب و لہجہ اور خصوصاً عورتوں کے نفسیاتی مسائل کے ذریعہ اُردو شاعری کو نئی جہت عطا کرتی ہیں اور اردو شاعری کے ایوان بالا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خوشبو بن کر مسافران ادب کے ذہن و دل کو معطر و معتبر کرتی رہتی ہیں۔ ان کا یہ شعر انہیں کے لہجے میں:

مر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بھلا ہی دیں گے
لفظ میرے میرے ہونے کی گواہی دیں گے

☆☆☆

Adab,Culture aur Revayat by Dr. Mohammad Latif Mir

(HOD Urdu Govt. Degree College ,Rajouri) cell-9596822463

ڈاکٹر محمد لطیف میر (صدر، شعبہ اُردو گورنمنٹ ڈگری کالج راجوری (جموں وکشمیر)

ادب، کلچر اور روایت

سید عابد حسین نے اپنی مشہور کتاب ''قومی تہذیب کا مسئلہ'' کے مقدمہ میں تہذیب کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''علمی کاموں میں سب سے زیادہ دقّت طلب کام تعریف خصوصاً مجرد تصورات کی تعریف ہے۔ ایک ایسا کلی تصور قائم کرنا جو بے شمار جزئیات کو اپنے احاطے میں لے لے، بڑی دردِسری چاہتا ہے۔ سقراطؔ سے جو ایتھنز والے عاجز آ گئے تھے اُس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہر شخص کو مجرد تصورات مثلاً عدل، شجاعت، عفت اور عشق کی تعریف پر مجبور کرتا تھا اور جرح کرتے کرتے اُس کا ناک میں دم کر دیتا تھا۔۔۔''(۱)

سید عابد حسین مرحوم کا خیال مبنی بر حقیقت ہے۔ مجرد تصورات کی تعریف قطعیت کے ساتھ ناممکن ہے۔ ادب پر متعدد بحثیں ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ اِسی طرح قطعیت کے ساتھ تہذیب، تمدن، روایت وغیرہ پر کچھ کہنا دشوار ہے۔ حالاں کہ موٹے طور پر اِن مجرد تصورات کی لشٹم پشٹم تعریفات کی جا سکتی ہیں۔ ''تہذیب''، سید عابد حسین کا خیال ہے کہ اِس کے سب سے مشہور معنی ہیں پاکیزہ و پسندیدہ اخلاق و آداب۔ جس شخص کی طبیعت، چال ڈھال، گفتگو اور برتاؤ میں ایک خاص موزونیت اور دلکشی ہو، وہ مہذب کہلاتا ہے۔'' اِس کے علاوہ ان کا خیال ہے کہ مادی چیزوں پر بھی تہذیب کا اطلاق ہوتا ہے جو اِنسان کے حسنِ ذوق اور حسنِ عمل سے وجود میں آتی ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''ہم مغلوں کے عہد کی عمارتوں، باغوں اور تصویروں کو مغلیہ تہذیب کے آثار کہتے ہیں۔ اِس کے علاوہ کسی قوم کے اجتماعی ادارات اور اصول و قوانین بھی تہذیب کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں''۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ تہذیب دراصل حسنِ ذوق اور حسنِ عمل کا نام ہے۔ لیکن یہ سوال بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ کیا ایک

قوم کے تہذیبی عناصر دوسری قوم کے لیے حسنِ ذوق اور حسنِ عمل کے حوالے سے باعثِ کشش ہو سکتے ہیں۔ یا اُن کے ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں؟۔شاید نہیں! مثال کے طور پر کسی ایک قوم کی مذہبی یا ثقافتی تعمیرات پر بنی انسان کی ایسی برہنہ تصویریں جو کسی دوسری تہذیب میں معیوب سمجھی جاتی ہیں، وہ کیوں کر اُس قوم کے فرد یا افراد کے ذوقِ جمال کی تسکین یا تہذیب کر سکتی ہیں۔

روایت، دراصل نام ہے اُن اعتقادات، رسومات اور نیم تاریخی قصے کہانیوں کا جن کا تعلق ماضی سے ہو اور جن کو سماج نے تاریخ کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیا ہو مگر ان کی تصدیق کسی بھی ذرائع سے کم ہی ممکن ہو۔ یہ ایک نسل سے دوسری نسل، یا ایک گروہ سے دوسرے گروہ یا ایک طبقے سے دوسرے طبقے کو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہے۔ اِس کی کوئی سائنٹی فک بنیاد نہیں ہوتی۔ روایت، کلچر کا جزوِلاینفک ہوتی ہے۔ یہ خاندان اور سماج کے بنیادی ڈھانچے کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ کلچر کے حوالے سے جناب اختر انصاری کا خیال ہے کہ جوں ہی ہم خاندان اور سماجی زندگی کا جائزہ لیں گے، اقدار سے متعلق سوالات بھی اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اِن لوگوں کا عقیدہ کیا ہے؟ زندگی، موت اور حیات بعدالموت کے بارے میں ان کے خیالات کیا ہیں؟ وہ کس قسم کے خُدا یا دیوتا پر یقین رکھتے ہیں۔ حسن، صداقت اور نیکی کی ان کی میں کیا حثیت ہے؟۔ اِن کی سماجی زندگی کن مقاصد کی محکوم ہے؟۔ مطلب ہم ان کے مذہب، فلسفے اور فکریات کے بارے میں جاننا چاہیں گے۔ کلچر کے یہی وہ پہلو ہیں جن کہ ہم اقدار کا نام دیتے ہیں۔'' (۲) اب یہی وہ مقام ہے کہ جہاں ادب یا ادیب کو اِن مذکورہ تمام چیزوں کے بارے میں ایک واضح قطعی اور سائنٹی فک نقطہء نظر اختیار کرنے کی ضرورت پیش آنی چاہیے۔ یعنی یہ سوال کہ کیا ادب یا ادیب کو یہ چیزیں من وعن پیش کر کے مطمئن ہو جانا ہے یا پھر اِن میں غیر صحت مند عناصر کی کانٹ چھانٹ بھی کرنی چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ کلچر ایک طاقت ور قوت کا نام ہے تاہم اگر اِس کے اجزائے ترکیبی پر سائنٹی فک انداز سے سوچا نہ جائے تو پھر بہت سے عناصر (روایات) ایک صحت مند مستقبل کی تخلیق کی راہ میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اہلِ مغرب نے اِس حوالے سے سائنٹی فک اور صحت مند پیش رفت کی ہے جب کہ اہل مشرق صحت مند اور غیر صحت مند دونوں طرح کی روایات کو سینے سے لگائے پھرتے

ہیں جس کا واضح نتیجہ یہ کہ یہ (اہل مشرق) اُن کے دستِ نگر ہیں۔ یہاں یہ سوال بھی پید ہوتا ہے کہ کیا ادب فرسودگی کا نام ہے؟ یا ادب اور ادیب دونوں کو فرسودہ روایات پر بے دریغ وار نہیں کرنی چاہیے۔؟ لیکن روایات کا عادی سماج اور ادب اور ادیب، کلچر کے اِس سرطان زدہ حصے (فرسودہ روایات) سے اپنا پیچھا چھڑا سکتے ہیں؟۔ روایات کا خوگر سماج آزادانہ غور وفکر کا عادی نہیں ہوتا اور یوں اِس سماج میں تسخیر و اکتشاف کا عمل جمود کا شکار ہو جاتا ہے۔ روایات کا عمل چلن اکثر اُس طبقے میں فروغ پاتا ہے کہ جہاں عقل پر عقیدت غالب آجاتی ہے۔ اکثر روایات جب ادب یا مذہب میں راہ پاتی ہیں تو فکری التباسات کو جنم دیتی ہیں۔ بیشتر روایات، خوش فہمیوں کا بھی باعث بنتی ہیں اور خوش فہمیاں سماج کو رومانی طرزِ فکر کا حامل بنا دیتی ہیں۔ روایات پر مبنی سماج میں سائنسی مزاج، انسان کی فکر کا حصہ نہیں بن سکتا۔ اگر چہ کہ روایات ہمیں ماضی میں جھانکنے اور اپنے بزرگوں کی علمی و ادبی صحت مند اور غیر صحت مند دونوں طرح کی اقدار سے واقفیت حاصل کرنے میں مدد بھی دیتی ہیں۔ جیسا کہ اُوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ کلچر، جس کی بنیاد عقائد، روایات، رسومات توہمات، مذہبیات اور رہن سہن کے طور طریقوں پر قائم ہوتی ہے، سماج کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کلچر کسی قوم کی مجموعی تعمیر و ترقی میں ایک طاقت و رقوت کا نام ہے۔ روایات، انسان کی ساری زندگی کو محیط ہوتی ہیں۔ روایات کے مجموعی اثرات سے کوئی شعبہء زندگی خالی نہیں ہے۔ یہ جوں جوں اِنسان کے مزاج اور سوچ وفکر کا حصہ بنتی ہیں، توں توں وہ (اِنسان) اِن کو اپنا دین وایمان سمجھنے لگتا ہے۔

آج نہ صرف علم وادب بل کہ مذہب بھی روایات سے خالص نہیں ہے۔ اکثر روایات Mythology کے زمرے میں آتی ہیں اور علمی، ادبی اور مذہبی مغالطے پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہیں۔ اکثر بڑی شخصیات نے متعدد روایات اپنے ہاں برت کر فکری التباسات پیدا کی ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم خضرِ راہ میں ''خضر'' (جاننا چاہیے کہ مسلم تفاسیری اور روایاتی مآخذ میں ''خضر'' کو ایک مذہبی، روحانی شخصیت تسلیم کیا گیا ہے بلکہ بعضوں نے اُن کو پیغمبر بھی قرار دیا ہے) کو موسیٰ علیہ السلام پر ترجیح دے کر اِس مذکورہ روایت کو عوام کے ایمان کا حصہ بنا دیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ماہرین کے نزدیک اِسلامی مآخذ میں ''خضر'' نامی شخصیت کی کوئی اصل نہیں ہے۔ خود قرآنِ کریم میں موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں جس بزرگ

کا ذکر کیا ہے، وہ دراصل خُدا کی طرف سے ایک آزمائش تھی اور بہت ممکن ہے کہ وہ اللہ تعالی کا کوئی بزرگ فرشتہ رہا ہو جو اِنسانی شکل میں موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوتا ہے۔(قرآن کے الفاظ ''۔۔۔فوا جدا عبدا مِن عبادنا اتینہ رحمتہ عندنا و علمنہ مِن لدنا علما ''اور وہاں انہوں نے (موسیٰ علیہ سلام نے) پایا ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔(سورہ الکہف آیت نمبر ۶۵) جس کو اللہ تعالی نے ایک خاص علم دے کر بھیجا تھا ،اور ایک خاص کام پر مامور کیا تھا۔ اِس واقعے میں موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کا امتحان لینا مقصود نہیں تھا بلکہ اُن کے پردے میں دنیا پر یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ کسی بھی اِنسان کو ''علمِ کُل'' نہیں دیا گیا ہے۔یعنی ''علمِ کُل'' اور علمِ کل'' سب خُدا کی ذات میں مرکوز ہیں۔لیکن ہمارے انسان ساختہ مذہبی سرمائے میں اور اِقبال ایسے دانشور کے شعری افکار میں جس طرح ''خضر'' کو موسیٰ علیہ سلام کے واقعے کے ساتھ جوڑ کر صاحبِ اسرار بزرگ باور کیا ہے اور جس کو صحراؤں اور بیابانوں میں عوام الناس کی رہنمائی کرتے دکھایا ہے، اِس کی کوئی بنیاد ہمارے اصل مذہبی سرمائے میں مطلق نہیں ہے۔اور اِس طرح کی اسرائیلیات سے ہمارے قصاص مفسرین، روایتی علما اور صوفی مزاج شعراء نے بہت مغالطے پیدا کیے ہیں۔مزے کی بات یہ ہے کہ مشہور صوفی بزرگ شیخ محی الدین اِبن العربی نے ''خضر'' سے اپنی ملاقات کا دعوی کیا ہے۔انہوں نے یہ دعوی بھی کیا ہے کہ انہیں یعنی ابن العربی کو خرقہءتصوف بھی خود ''خضر'' نے پہنایا ہے۔اِس طرح کے قصے کہانیاں سماج کو افکار کی سطح پر زنگ آلود کر دیتی ہیں۔اِس لیے ایک صحت مند سماج کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے اہلِ علم کو روایات کی چھان پھٹک کرتے رہنا چاہیے تاکہ صحیح علم یا حقیقت تک رسائی ممکن ہو سکے۔

خواب آور بشارتوں کا سلسلہ کسی بڑی شخصیت سے جڑ جائے یا جوڑا جائے تو پھر سماج میں اِن کو جواز فراہم ہو جاتا ہے۔اور یوں صوفیانہ، عارفانہ، مراقبانہ طرزِ فکر، تسخیر و اکتشاف اور حقیقت پسندی نیز بے آمیز نقد و نظر کو بے معنی بنا دیتا ہے۔اِس سے ایک بڑا فکری التباسات جنم لیتا ہے جو انسان اور انسانی فکر کو سفرِ معکوس کا شکار کر دیتا ہے اور یوں ''شخصیات'' کو تقدس فراہم ہو جاتا ہے اور اُن کے فرمودات ،ملفوظات نیز قیل و قال کو ''الہامی'' درجہ حاصل ہو جاتا

ہے۔ہم یہاں علامہ اقبالؔ کی پیدائش سے ذرا قبل کا ایک واقع درج کرتے ہیں جس کو لگ بھگ تمام مصنفین (جنہوں نے اقبالؔ پر کام کیا ہے) نے اُس کا حوالہ دیا ہے۔ خلیفہ عبدا لحکیم (1893-1959) جن کا علم وفضل کسی تعارف کا محتاج نہیں، نے والدِ علامہ اِقبال سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے اُنہیں خُدا رسیدہ صوفی قرار دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ پاکیزہ اِسلامی تصوف کا اِقبال کو باپ سے میں ملا۔ انہوں نے اِس ضمن مولانا رومی کا ایک شعر:

بزیر کنگرہء کبریاش مردانند   فرشتہ سیر و پیمبر شکار و یزداں گیر

بھی پیش کیا ہے جس میں عارفوں سے متعلق کہا ہے کہ وہ شکاری ہوتے ہیں۔۔۔ پھر وہ (خلیفہ عبدالحکیم) اقبال کی پیدائش سے متعلق والدِ اقبال کے ایک خواب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

پہلی ہی ملاقات میں شیخ نور محمد صاحب نے اقبال کی پیدائش کا دلچسپ قصہ مجھ سے بیان کیا۔ فرمانے لگے کہ اقبالؔ ابھی ماں کے پیٹ میں تھے کہ میں نے ایک عجیب خواب دیکھتا ہوں۔کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت خوشنما پرندہ سطحِ زمیں سے تھوڑی بلندی پر اُڑ رہا تھا۔ بہت سے لوگ ہاتھ اُٹھا کر اور اچھل اُچھل کر اِس کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ کسی کی گرفت میں نہیں آیا۔ میں بھی ان تماشائیوں میں کھڑا تھا اور خواہش مند تھا کہ غیر معمولی جمال کا پرندہ میرے ہی ہاتھ آجائے۔ اچانک وہ پرندہ یکا یک میرے آغوش میں آگرا۔ میں بہت خوش ہوا اور دوسرے منہ تکتے رہ گے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجھے اس خواب کی تعبیر القا ہوئی کہ عالمِ روحانی میں میرا پیدا ہونے والا بچہ ہے جو صاحبِ اقبال ہوگا'' (۳)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر خواب آور بشارتوں کے سہارے علمی وادبی صحت مندی اور تخلیقی تازہ کاری کا کیا جواز ہے؟۔ یہ دراصل شخصیت پرستی کے حوالے سے جذباتی عقیدت اور غلو کا مظہر ہے۔ یہ مسئلہ صرف علامہ اقبال کی حد تک نہیں ہے بلکہ علم و ادب کے پورے سرمائے میں اِس طرح کی اندھی عقیدت کا مظاہرہ اکثر ناقدین، محققین اور مفسرین کی جانب سے بھی دیکھنے کو ملتا رہتا ہے۔یعنی کسی بھی شخصیت، جس کو بعد میں بڑا بننا ہے، کے اردگرد تقدیس کا ہالہ پہلے ہی کھینچ دیا جاتا ہے اور یوں اُس کے فکر وفلسفہ کی بنیاد کسی حد تک ''الہام'' پر رکھ دی جاتی ہے جو قاری یا عوام الناس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اِس کو پرکھنے، تجزیہ کرنے، سوال

اُٹھانے کے بجائے ''آمنّا وصدقّنا'' کہہ کر سرمایا حیات قرار دیں۔حالاں کہ یونانیوں نے ہمیں سوچ پر سوچنا سکھایا تھا یعنی اپنی سوچ پر پھر سوچیں۔ارسطو کی منطق بقول حبیب حق ''ایسی ہی ایک کامیاب کوشش ہے''۔اصل میں ''ادب''، جو سماج کا آئینہ ہے، کا بنیادی کام ہی یہی ہے اور ہونا چاہیے کہ وہ سماج کو سوچنے، سوال کرنے، چیزوں کو پرکھنے اور تجزیے کی میز پر لانے کی راہ پر ڈالے یعنی روایت ہو، کوئی تاریخی یا نیم تاریخی واقعہ ہو، کوئی قصہ ہو یا کوئی انسان ساختہ مذہبی روایت یا قصاص دانشوروں کی دانشوری۔ اِن سب کو نقد و نظر کے ترازو میں تول کر عوام کے سامنے پیش کرے۔

حواشی / تعلیقات:

۱۔ قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی۔ایڈیشن ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۳

۲۔ غزل اور غزل کی تعلیم۔قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی۔ایڈیشن ۲۰۰۱ء صفحہ ۲۲

۳۔ فکرِ اقبال۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، علی گڑھ۔ایڈیشن ۲۰۱۴ء صفحہ ۱۷

☆☆☆

نظمیں Nazmein

Mohd. Khurshid Akram "Soz"
(Kolkata)cell-9850315070
محمد خورشید اکرم سوزؔ (کولکاتا)

چائے جب بھی پیتا ہوں
(بابو شکیب اکرم کی یاد میں)

چائے تھوڑی پینے سے
دل کو چین آتا ہے
روح سکون پاتی ہے
کچھ قرار آتا ہے

شرط ہے مگر اتنی
چائے میں ہو وہ لذت
جیسے میرے ماتھے پر
لمس ہو ان ہاتھوں کا
میرے پیارے بابو کا!

میرا بابو تو لیکن
روٹھ کر بہت مجھ سے
چھوڑ کر مجھے تنہا
دور ایسی دنیا میں
جا بسا جہاں سے اب
لوٹنا ہے ناممکن !

چائے کی پیالی سے
بھاپ جب بھی اٹھتی ہے
اس کی یادوں کی خوشبو
ذہن و دل پہ چھاتی ہے
لمس اس کے ہاتھوں کا
یاد مجھ کو آتا ہے
چائے جب بھی پیتا ہوں

چائے کی پیالی تو
یادوں کا سمندر ہے
ہر اک گھونٹ میں جس کے
درد و غم کی ہے لذت
اور اب یہی غم تو
جینے کا سہارا ہے
☆☆☆

Parvin Shere (New York, USA)
cell-001-6506565271
پروین شیر (نیو یارک، امریکہ)

وہ میری آنکھیں یہ میرے آنسو

فلک کے آنچل پہ/ بکھرے بکھرے
جو نور پارے چمک رہے ہیں
فلک شناسوں!
انہیں ستارے کا نام مت دو
وہ میری آنکھیں ہیں
ہر طرف اس کو ڈھونڈتی ہیں
نہ جانے کس کائنات میں اب
جو کھو گئی ہے/ زمیں کے سینے پہ
خوبصورت رنگ پارے/ سنور گئے ہیں
زمیں شناسوں!
انہیں بھی پھولوں کا نام مت دو
یہ میرے آنسو ہیں جن کی خوشبو
زمیں کے اندر اتر کر اس کی
تلاش میں ہے/ وہ جانے کتنی تہوں میں مٹی کی
کھو گئی ہے!!

☆☆☆

یہ چاند لمحے

تو یوں ہوا
کہ تیرگی بے نشاں ہوئی ہے!
یہ چاند لمحے، ستارہ محفل
جو تیرے پیکر سے ہیں فروزاں
یہ روشنی کی ردا میں جاں کو سمیٹتے ہیں
ہنسی کے جگنو
جو تیرے لب پر دمک رہے ہیں
اندھیری راہیں اجالتے ہیں
گلاب عارض/ ہوا میں خوشبو کے نرم ریشم
بکھیرتے ہیں
جو تجھ کو دیکھوں تو میری آنکھوں کی سرزمیں پر
مسرتوں کی پھوار کرتی ہے آبیاری
اسی کے نم سے
شجر یہ جاں کا ہرا بھرا ہے
جو تجھ پہ سایہ فگن ہوا ہے
وہ کس قدر تھی
حسین ساعت، رحیم ساعت، کریم ساعت
کہ جب مرے دامن دعا میں
عطا کیا تھا تجھے خدا نے
او میرے بچے!!

☆☆☆

Parvez Muzaffar (Birmingham)
U.K. cell- 0044-781-478-3097
پرویز مظفر (برمنگھم، یو۔کے)

Roop روپ

دنیا میں حفاظت کا
قانون کہاں ہے
آگے پیچھے چلتے
خوشی اور غم
ہمارے غم خوار
ایسے چپ ہیں
کہ بس

Nazm نظم

کچھ کہو گے
یا ضد میں رہو گے
لمحے جب ڈوب جائیں گے
بیٹھو گے جدھر
ہم یاد آئیں گے
وہ زخم اور مرہم
جو تم نے لگائے
صدیاں ہو گئیں انہیں چھپائے
بخیے ادھیڑتے ہیں اب
ہائے ہائے

Nazm نظم

کچھ تو ہم کو کرنا چاہیے
ورنہ جائیے
آپ بھی جائیے
دیکھئے نکل پڑے ہیں
تیر کمان سے
آج پھر دو چار جائیں گے جان سے
کب سے
ملبے کے نیچے دبی
چیخیں سنائی دیتی ہیں
دل پر کچھ اثر نہیں
ذرا پھر سے سنئے دھیان سے
تب شاید
آپ کو اپنے ضمیر کی آواز سنائی دے گی
حقیقت کی تصویر دکھائی دے گی

☆☆☆

Dr. Shabnam Ashai (Srinagar)
cell-97977795748
ڈاکٹر شبنم عشائی (سرینگر)

(1)

تم محبت سے میرا من گوندھتے
میں روشنائی سے
اپنی تنہائی گوندھتی!
تنہائی گوندھتے گوندھتے
میں روٹی پکانا
بھول گئی ہوں
کیا عورت ایسی ہوتی ہے!
حیرت کے دکھ کو
کیسے سہلاؤں!
من کے تسمے کستی ہوں
سفر میرا خواب نہیں
گھر کا دروازہ
بند پڑا ہے

(2)

آنسو بہا دوں
کہ نظم لکھوں؟
آنسو کھنگالیں گے
من کو!
نظم بہلائے گی
دل کو! / ڈھل جاؤں
کہ بہل جاؤں؟
۔۔۔نہیں تو نراشا
میرے پیروں میں
پازیب توڑ کر / پھر کوئی سفر
باندھ دے گی!

(3)

تم نے من مانی کی
میں نے / موت کو
اپنی انگلیوں میں چھپا لیا
جب سے / تمہارے محل میں نہیں
موت کی خوشبو میں
جی رہی ہوں / تم اور میں
ہم ہوتے / اور ہم
ہم دونوں کا سوز و ساز!
زندگی اپنی کشتی سے ہمیں
آزاد نہ کرتی
تم / اور میں
بے نشاں قبروں کے اندھیرے میں
یوں
کھو نہ جاتے!

☆☆☆

غزلیں Ghazlein

Rafiq Raaz (Srinagar)
رفیق رازؔ (سرینگر) cell-7889968878

معنی کا نور حرف کے کاسے میں ڈھال دے
ذہنوں کو شعروں سے مرے یا رب اجال دے
خاموشیوں کے نور سے تو بھر گیا ہے تو
لب کھول کے سماعتوں کو اب اجال دے
دھرتی پہ بھیج شوق سے باد سموم کو
شاخوں کو پہلے برگ درختوں کو چھال دے
بارِ گراں سے دوہری ہوئی ہے تری کمر
نیکی جو تو نے کی تھی وہ دریا میں ڈال دے
ویرانی دیکھی جاتی نہیں مجھ سے دشت کی
وحشت دے مجھ کو یا پھر اسے ہی غزال دے
اے خالقِ زمین و زماں تجھ سے کیا بعید
ماضی سے میرے حال کو واپس نکال دے
اپنی حدیں پھلانگتا رہتا ہوں بار بار
مجھ کو مرے وجود کی آتش میں ڈال دے

(2)

زخمی ابھی جو ضرب قدم سے ہوا نہ ہو
ایسا ہو دشت جس میں کوئی نقش پا نہ ہو
ہو جاؤں آشکار نہ دنیا پہ میں کہیں
ابر سیہ کی قید سے بجلی رہا نہ ہو
مشہور اہل قافلہ میں جس کی چھاؤں ہے
ممکن ہے وہ شجر بھی سلامت رہا نہ ہو
بے گھر شرر کا حال تو روشن ہو داغ پر
اک ڈھیر خشک پتوں کا اس کا ٹھکانہ ہو
گم گشتگی کا نشہ رہے یونہی برقرار
جنگل سے واپسی کا کوئی راستہ نہ ہو
ایسا چمن بھی روئے زمیں پر ہے کیا کہیں
نوحہ خزاں نے جس میں ابھی تک پڑھا نہ ہو
ہونا تھا جس کو خاک ترے عشق میں ہوا
آندھی نے بھی اب اس کو پریشاں کیا نہ ہو
جلتا ہو میرے طاق سیہ خانہ میں چراغ
اور باد تند و تیز کو اس کا پتہ نہ ہو

(3)

کس سمت اب کہاں نہ ہمارے قدم گئے
لیکن تری زمیں پہ کہیں بھی نہ جم گئے
اس کی سماعتوں نے بھی راحت کی سانس لی
میری خموشیوں کے بھی طوفان تھم گئے
جس آنکھ اور دریچے کے چرچے تھے شہر میں
منظر بہ کف اس آنکھ کی جانب بھی ہم گئے
جب چاپ میری گونج اٹھی معجزہ ہوا
اس سانپ سی سڑک کے سبھی پیچ و خم گئے
اس روح کے دیار میں اڑتی ہے تب سے خاک
آنکھوں سے جب سے اشک گئے دل سے غم گئے

☆☆☆

Ahmad Shanas (Jammu)
احمد شناس (جموں) cell-8803500711

وصال و ہجر کے جنگل میں سر گرداں
وہ کوئی دیوتا ہے یا پجاری ہے
ابھی ہر بند کھل جائے گا نظروں کا
کہ غنچے پر شگفتہ ناز طاری ہے
رہے گی صبح تک یہ ہجر کی محفل
ستارہ وار جل اٹھنے کی باری ہے
قیام اپنا ہے بال و پر کی صورت میں
مقام اپنا پرندے کی اٹاری ہے
ہماری دشمنی ظاہر نہیں ہوتی
ہماری دوستی میں رازداری ہے
طلب جینے کی ہے دل میں نہ مرنے کی
حساب عمر صبح و شام جاری ہے
ہم اک لمحہ ءآئندہ میں زندہ ہیں
وہ اک لمحہ کہ جس کا فیض جاری ہے
ہم اپنی رات کا غم ڈھو چکے احمدؔ
کہ اب ننھے سے اس جگنو کی باری ہے

☆☆☆

(2)

اتر جا دائرے میں کھیل جاری ہے
میں باہر آ گیا اب تیری باری ہے
یہاں پہچان اپنی خاکساری ہے
وہاں اک چاند سے نسبت ہماری ہے
ہے سامان تجارت شہر کا یارو
محبت ہے کہ وہ نفرت ہماری ہے
وہی تخلیق مفروضہ کہانی کی
وہی عادت ہے میری جو تمہاری ہے
وہ جادو گر بڑے کرتب دکھاتا ہے
مگر یہ سب تماشہ اعتباری ہے

(3)

ہر ایک موسم ہے اس جہان فنا کا احمدؔ حیات امکاں
بکھر رہا ہوں کہ میرا نخل وجود ہے پات پات امکاں
میں چند بوندوں کی روشنی سے کھلا ہوا ہوں دھنک کی صورت
تمہاری بارش سے کچھ زیادہ مری طلب ہے نشاط امکاں
مجھے ابھی تک خبر نہیں ہے کہ اصل میں میرا گھر کہاں ہے
مکاں کی کھڑکی سے دیکھتا ہوں وہ ایک خیمہ ثبات امکاں
ہمیں اکیلے نہیں جو ہونے کی آرزو میں سلگ رہے ہیں
ہر ایک پتھر چیخ رہا ہے ہر ایک ذرہ ہے ذات امکاں
جو گھر میں خالی جگہ تھی احمدؔ نفیس چیزوں سے بھر گئی ہے
خوشی نہیں تو سجا لیا ہے کوئی تکلف نشاط امکاں

☆☆☆

Omar Farooq (Kanpur)

عمر فاروق (کانپور)

عجلت نہیں ، یہ راہِ جنوں ہے خرد نہیں
ہے رہگذر یہ ایسی کہ منزل بھی حد نہیں
آ کر کھڑے ہوئے ہو مقابل میں یار کے
قامت کہاں گئی کہ تمہارا یہ قد نہیں
یارانِ شہر بھول گئے مجھ کو اس قدر
نام و نسب نمود و نمائش حسد نہیں
غائب کے ساتھ حاضرِ محفل کی خیر ہو
حاضر اگرچہ تم ہو مگر یہ سند نہیں
دستورِ کائنات نظامِ عمل سے ہے
دنیا کے فیصلوں سے کوئی نیک و بد نہیں

(2)

اب یہ ممکن ہے کہ ہم تم بھی جدا ہو جائیں
اور پھر دونوں خود اپنے میں خُدا ہو جائیں
پہلے پہلے تو محبت کے فسانے چھیڑیں
بعد میں اپنے فسانوں سے خفا ہو جائیں
زندہ رہنے کے لئے خواب کی تعبیر کے ساتھ
جاگنے سے کہیں پہلے ہی فنا ہو جائیں
اس کو معلوم نہیں دارو رسن کی حیرت
جو بھی سولی پہ چڑھیں اپنی بقا ہو جائیں
تجھ کو بھولوں تو کوئی حرف نہ پھر یاد رہے
لفظ و معنی کے لئے ایسی سزا ہو جائیں

(3)

فیصلے ہو چکے دریا کی نگہبانی کے
لوگ الجھے ہیں تماشے میں ابھی پانی کے
ایک کاسے میں پڑے تھے کئی سر، تاج کے ساتھ
ہم نے دیکھے ہیں سبھی رنگ بھی سلطانی کے
خود کو پامال کیا اس کی رضا کی خاطر
بھید کھلنے لگے پھر شب میں بھی حیرانی کے
ڈوبنے والے کو افسوس کہاں تھا کہ وہ خود
دشت میں کرتا تھا چرچے تری طغیانی کے
شہر آباد ہیں لیکن سبھی آثار تو ہیں
غور سے دیکھو وہ آثار ہیں ویرانی کے

(4)

غالب کی غزل میر کی تفسیر سے نکلی
تفسیر ترے حسن کی تعبیر سے نکلی
حیران ہیں زنداں میں اسیرانِ محبت
منزل کی مسافت مری زنجیر سے نکلی
گفتار کی ضد پہ وہ جسے پوج رہے تھے
اس کی بھی خدائی مری تحریر سے نکلی
اک عکس جو دھندلا سا کہیں گم تھا مجھ ہی میں
اُس عکس کی صورت تری تصویر سے نکلی
جو دشت میں پامال ہوئے جاتے ہیں ان کی
ہر غم کی وراثت تری جاگیر سے نکلی

☆☆☆

Zulfeqar Naqvi (Srinagar)
ذوالفقار نقوی (سرینگر) 9797580748

اندھیرے سے الجھنے کی کوئی تدبیر کرنا ہے
کوئی روزن کسی دیوار میں تسخیر کرنا ہے
ذرا دیکھوں تو کتنا دم ہے اس بادِ مخالف میں
گھروندا اک سرِ دشتِ بلا تعمیر کرنا ہے
نکل آیا ہے جو بیدار راہوں پر دلِ بے خود
کوئی ناوک فگن آئے ،اِسے نخچیر کرنا ہے
سرِ دشتِ جنوں جو بے خودی کے پھول کھلتے ہیں
انہیں روشن دماغوں کے لئے اکسیر کرنا ہے
مکانِ لا مکانی کا سفر میرا نہیں رکتا
تمہاری یاد کو اب پاؤں کی زنجیر کرنا ہے

(2)

دھواں تھا چار سو اتنا کہ ہم بے انتہا روئے
لگی جو آگ بستی میں تو سارے مبتلا روئے
عجب جدت مرے اطراف میں جلوہ فروزاں تھی
کہ میری خاک سے شعلے لپٹ کر بارہا روئے
مری آواز گونجے اس طرح پتھر کے سینوں میں
کہ ان کے دل کے خانوں میں چھپا ہر اژدہا روئے
الٰہی بھیج دے ایسا کہ جس کے خوف سے فوراً
اَنا سر پیٹتی جائے ،جفا کا ناخدا روئے
مرے آغاز میں مجھ کو ہی رونا تھا ،سو میں رویا
نہ جانے کیوں مرے انجام پر شاہ و گدا روئے

(3)

تیری تخلیق کا خلاصہ ہوں
تو مصور میں تیرا نقشہ ہوں
منعکس مجھ سے صورتیں تیری
اِس تماشے کا میں ہی پردہ ہوں
غیر ہو جاؤں غیر ممکن ہے
"کن" سے پہلے کا میں ارادہ ہوں
تیرگی مجھ سے کیوں نہ ہو خائف
روشنی کا میں استعارہ ہوں
مجھ سے امیدِ بے گناہی کیوں
آدمی ہوں کہ میں فرشتہ ہوں؟

(4)

مجھ کو تیری چاہت زندہ رکھتی ہے
اور تجھے یہ حالت زندہ رکھتی ہے
ڈھو ڈھو کر ہر روز جسے تھک جاتا ہوں
اُس ساماں کی سنگت زندہ رکھتی ہے
چڑھتے سورج کی میں پوجا کرتا ہوں
یار یہی ایک خصلت زندہ رکھتی ہے
چوم کے ہاتھوں کی ریکھائیں سوتا ہوں
خوابوں کی یہ دولت زندہ رکھتی ہے
پل دو پل آنگن میں تیرے رہتا ہوں
ایک یہی تو فرصت زندہ رکھتی ہے

☆☆☆

Suhail Iqbal(Saudi Arabia)
whatsapp no. 00966-554711667
سہیل اقبال (سعودی عرب)

خوابیدہ بشر تھا جسے بستر سے نکالا
پھر گھر کی ضرورت نے اسے گھر سے نکالا
کیا طرز مسیحائی تھا ان چارہ گروں کا
کنکر بھی مری آنکھ کا خنجر سے نکالا
انسان نہ سمجھا مجھے آشفتہ سروں نے
مسجد سے نکالا کبھی مندر سے نکالا
لگتا ہے مرے نام کا یہ آخری خط ہے
مطلب تو یہی نامہء دلبر سے نکالا
پیشانی پہ لکھا تھا شناور ہے غضب کا
جب سب نے شناور کو سمندر سے نکالا
بس یونہی پڑا رہتا ہے کرتا نہیں کچھ بھی
اس بات پہ اپنوں نے مجھے گھر سے نکالا
انسان نے پھر بخشا اسے شرف عبادت
پیکر جو کسی راہ کے پتھر سے نکالا
اک قیس نے آباد کیا صحرا کو لیکن
صحرا نے مجھے عشق کے چکر سے نکالا

☆☆☆

(2)

خنجروں، برچھیوں، بھالوں کے خزانے نکلے
شہر میں ہر جگہ قاتل کے ٹھکانے نکلے
سمتِ مشرق سے ادھر شمس نمودار ہوا
اور ہم گھر سے اِدھر روزی کمانے نکلے
ہم کہ انجام سے واقف تھے مگر کیا کرتے
پھر ہواؤں میں چراغوں کو جلانے نکلے
شہر کے امن کو شعلوں کے حوالے کر کے
صورتِ حال کا اندازہ لگانے نکلے
وار کرتے ہیں کچھ ایسے کہ پتا بھی نہ چلے
یار میرے، مرے دشمن سے سیانے نکلے

(3)

میری دیرینہ روایت سے مجھے دور نہ کر
میرے بیٹے مجھے سمجھوتے پہ مجبور نہ کر
یہ ہی کیا کم ہے کہ روٹی تجھے بھر پیٹ ملے
کار بنگلے کی توقع مرے مزدور نہ کر
دست و پا بھی مرے ہو جائیں نہ آرام طلب
اتنی آسائشیں دے کر مجھے معذور نہ کر
سامنے میرے تو غیروں کو گلے سے نہ لگا
وار کرنا ہے تو پھر اتنا بھی بھرپور نہ کر
مل کے ہر بار بچھڑنے سے تو مرنا بہتر
زخم کو زخم ہی رہنے دے تو ناسور نہ کر

☆☆☆

Rubina Mir (Rajouri)

روبینہ میر (راجوری) cell-9469177786

نہیں اس کا مسکن جہاں ڈھونڈتے ہیں
سکوں دل کا ہم بھی کہاں ڈھونڈتے ہیں
نہیں ڈالیاں تک بھی باقی شجر کی
یہ پنچھی ٹھکانہ کہاں ڈھونڈتے ہیں
نہیں ہم کو گھیرے ہوئے اک مصیبت
یہاں اور بھی امتحاں ڈھونڈتے ہیں
کٹی زندگی ان پریشانیوں میں
کرائے کا ہر دن مکاں ڈھونڈتے ہیں
سکوں وہ ملے گا کسی جھونپڑی میں
جسے محلوں کے درمیاں ڈھونڈتے ہیں
روبینہؔ جو محفوظِ برق و شرر ہو
ہم ایسا کوئی آشیاں ڈھونڈتے ہیں

(2)

الجھنوں کی بھیڑ میں جب بے طرح ہم کھو گئے
ایک بچے کی طرح پھر بلبلا کر رو گئے
ایسے میں جھوٹے دلاسے ماں کے کام آتے نہیں
تنگ آئے بھوک سے اتنے کہ بچے سو گئے
اس میں کیا ترمیم ہو قدرت کا یہ دستور ہے
وہ کبھی نہ آ سکے ہیں پھر پلٹ کر جو گئے
زندگی میں دیکھ پاتے کاش وہ ان کی بہار
گلستاں میں بیج پھولوں کے ہیں جو بھی بو گئے
زندگی میں جس سے بھی پائے ہیں اخلاص و وفا
ایک پل میں ہم دل و جاں سے اسی کے ہو گئے
ہم بھی ہیں انسان آخر ہم میں بھی احساس ہے
جس کو بھی دیکھا پریشاں ہم پریشاں ہو گئے
کیا کہیں روبینہؔ ان کو دیکھ کر ایسا لگا
اک خیالی خُلد میں جیسے کہ ہم ہوں کھو گئے

(3)

میں نے اپنے دل پہ پتھر رکھ دیا
رہگذر کا نام جب گھر رکھ دیا
آسماں نے بانٹے ہیں دنیا میں سُکھ
درد سب کا میرے اندر رکھ دیا
اس سے امیدِ وفا پھر کیا کریں
نام جس کا ہو ستم گر رکھ دیا
ہم پہاڑوں سے بھی ٹکرائے مگر
توڑ کر خود اپنا ہی سر رکھ دیا
بجلیوں کا اپنا پن تو دیکھئے
پھونک کر ہے میرا ہی گھر رکھ دیا
اس کے سر تھا جو کوئی الزام بھی
کیا کہوں سب کچھ مرے سر رکھ دیا
ہم نے روبینہؔ برائے زندگی
آستاں پر اس کے یہ سر رکھ دیا

☆☆☆

Bashir Badr ki adabi jehaat: Ahd-e-hazir ki Ghazal ka ek tanqidi Mutalea by Dr. Shafiq Ahmed Katoch (Associate Professor, dept. of Urdu GDC Government Degree College, Banihal)

ڈاکٹر شفیق احمد کٹوچ
(ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہء اردو جی۔ڈی۔سی۔گورنمنٹ ڈگری کالج بنہال، جموں و کشمیر)

بشیر بدر کی ادبی جہات: عہدِ حاضر کی غزل کا ایک تنقیدی مطالعہ

اردو شاعری کا سفر ہر عہد میں اپنے گرد و پیش کے بدلتے ہوئے حالات، انسانی رویّوں اور تہذیبی تغیرات سے اثر قبول کرتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں ایسے شعراء سامنے آئے جنہوں نے اپنے عہد کی روح کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اسے ایسی فنی صورت عطا کی کہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی معنویت اختیار کر گئی۔ جدید اردو غزل کے افق پر بشیر بدر کا نام اسی سلسلے کی ایک روشن کڑی ہے۔ انہوں نے غزل کو محض حسن و عشق کے محدود دائرے سے نکال کر انسانی وجود کی پیچیدگیوں، تہذیبی شکست و ریخت، سماجی انتشار، داخلی تنہائی اور رشتوں کی بدلتی ہوئی معنویت سے وابستہ کر دیا۔ ان کے یہاں غزل روایت کی خوشبو بھی رکھتی ہے اور عصرِ حاضر کی بے چینی بھی۔

بشیر بدر کی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر فنی لطافت کے باوجود قاری سے فاصلے پر نہیں رہتی۔ ان کا شعر بظاہر سادہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کی تہہ میں انسانی تجربے کی ایسی گہرائی موجود ہوتی ہے جو قاری کو دیر تک اپنے حصار میں رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں محبت محض ایک جذبہ نہیں بلکہ انسانی شناخت کا وسیلہ بن جاتی ہے، تنہائی صرف فرد کا مسئلہ نہیں رہتی بلکہ پورے عہد کی اجتماعی کیفیت میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور یاد محض ماضی کا حوالہ نہیں بلکہ وجود کی ایک مستقل معنوی حالت بن جاتی ہے۔

بشیر بدر نے اس دور میں شاعری کی، جب انسانی زندگی صنعتی ترقی، شہری تمدن اور

معاشرتی تبدیلیوں کے باعث نئی کشمکش سے دوچار تھی۔ رشتے رسمی ہوتے جا رہے تھے، محبت اظہار کے باوجود اعتماد سے محروم ہو رہی تھی اور انسان ہجوم میں رہتے ہوئے بھی تنہائی کا شکار تھا۔ ایسے ماحول میں بشیر بدر کی غزل نے انسان کے اندر بکھرتی ہوئی دنیا کو نہایت نرم لہجے میں بیان کیا۔ ان کے اشعار احتجاج سے زیادہ احساس پیدا کرتے ہیں، شور سے زیادہ خاموشی کی قوت پر یقین رکھتے ہیں اور فلسفے سے زیادہ انسانی تجربے کو اہمیت دیتے ہیں۔

ان کی شاعری کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ اس میں روایت اور جدت ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ تکمیل محسوس ہوتی ہیں۔ کلاسیکی غزل کی موسیقیت، لفظوں کی نزاکت، محاورے کی شگفتگی اور عروضی حسن اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں، لیکن موضوعات جدید زندگی کے مسائل سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یہی امتزاج انہیں اپنے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کے اشعار میں نہ تو روایت کا جمود ہے اور نہ جدیدیت کی غیر ضروری پیچیدگی، بلکہ دونوں کے درمیان ایک متوازن ادبی فضا قائم نظر آتی ہے۔ ان کی شخصیت کے ادبی مطالعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ انہوں نے زندگی کے تلخ تجربات کو اپنی تخلیقی قوت میں جذب کر لیا۔ ذاتی محرومیاں، ہجرت کے صدمات اور معاشرتی انتشار ان کی شاعری میں براہِ راست بیان نہیں ہوتے بلکہ ایک لطیف شعری پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزل میں ذاتی تجربہ بھی اجتماعی احساس بن جاتا ہے۔ یہ مقالہ بشیر بدر کی شاعری کا صرف موضوعاتی مطالعہ نہیں بلکہ ان کی ادبی بصیرت، فنی انفرادیت، اسلوبیاتی امتیازات اور فکری جہات کا تنقیدی جائزہ پیش کرے گا۔ کوشش کی جائے گی کہ ان کے منتخب اشعار کی روشنی میں یہ واضح کیا جائے کہ بشیر بدر نے جدید اردو غزل کو کن نئی جہات سے روشناس کرایا اور ان کا ادبی سرمایہ اردو شاعری کی روایت میں کس مقام کا مستحق ہے۔

بشیر بدر کا اصل نام بشیر احمد ہے۔ وہ 15 فروری 1935ء کو ایودھیا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے اردو ادب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں تدریس سے وابستہ رہے۔ علمی و ادبی ماحول نے ان کی تخلیقی شخصیت کو جلا بخشی، لیکن ان کی اصل شناخت بطور غزل گو شاعر قائم ہوئی۔ سن 1980 کی دہائی میں پیش آنے والے فسادات نے ان کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ گھر، ماحول اور یادوں سے جدائی نے ان کی

شاعری میں ہجرت، بے گھری اور انسانی عدمِ تحفظ کے احساس کو مزید گہرا کر دیا۔ یہی وہ تجربات ہیں جنہوں نے ان کے شعری لہجے میں ایک ایسی دردمندی پیدا کی جو محض ذاتی واردات نہیں بلکہ پورے عہد کی نفسیاتی کیفیت کی ترجمان بن گئی۔

بشیر بدر کی ادبی تربیت کلاسیکی شعری روایت کے زیرِ اثر ہوئی، لیکن انہوں نے اپنے عہد کے تقاضوں کو بھی پوری حساسیت سے محسوس کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں میر تقی میر کی داخلیت، مرزا غالب کی فکری لطافت اور جدید غزل کی عصری حسیت ایک نئے انداز میں باہم ملتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے یہاں تقلید نہیں بلکہ روایت کی تخلیقی توسیع ملتی ہے۔ اردو غزل کی روایت میں عشق ہمیشہ بنیادی موضوع رہا ہے، لیکن ہر عہد کے شاعر نے اس جذبے کو اپنے زمانے کی نفسیات اور سماجی شعور کے مطابق نئی معنویت عطا کی ہے۔ بشیر بدر بھی محبت کے شاعر ہیں، مگر ان کے ہاں عشق محض محبوب کے حسن، وصل و ہجر یا روایتی جذبات کی داستان نہیں رہتا بلکہ وہ انسانی وجود کی شناخت، اعتماد، قربت اور رشتوں کی داخلی کیفیت کا استعارہ بن جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں محبت ایک ایسی تہذیبی قدر ہے جو انسان کو انسان سے جوڑتی ہے، مگر جدید معاشرے کی مادّہ پرستی، خودغرضی اور عدمِ اعتماد اس تعلق کو مسلسل کمزور کرتی رہتی ہے۔

بشیر بدر محبت کو ایک زندہ احساس کے طور پر دیکھتے ہیں، نہ کہ محض شعری روایت کے ایک موضوع کے طور پر۔ اسی لیے ان کے اشعار میں محبت کی نزاکت کے ساتھ اس کی شکستگی بھی پوری شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ بدلتے ہوئے معاشرے میں تعلقات کی بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں، اس لیے ان کے یہاں عشق کا بیان بھی ایک داخلی کرب کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ان کا مشہور شعر ملاحظہ ہو:

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

یہ شعر اپنی سادگی کے باوجود جدید تہذیب پر ایک نہایت گہرا تبصرہ ہے۔ شاعر نے "شہر" کو صرف جغرافیائی اکائی کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ اسے جدید تمدن کی علامت بنا دیا ہے۔ یہاں انسان ایک دوسرے کے قریب رہتے ہوئے بھی جذباتی طور پر دور ہیں۔ محبت، اخلاص اور بے تکلفی کو کمزوری سمجھا جانے لگا ہے۔ اس شعر کی اصل قوت اس کی تہہ داری میں

پوشیدہ ہے۔پہلی نظر میں یہ ایک معاشرتی مشورہ معلوم ہوتا ہے،لیکن درحقیقت یہ پورے عہد کی نفسیاتی تصویر بن جاتا ہے۔بشیر بدر کی شاعری میں محبت کا ایک اہم پہلو اس کی خاموشی ہے۔ وہ بلند آہنگ اظہار کے بجائے دھیمے لہجے میں دل کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔یہی ان کے اسلوب کی انفرادیت ہے۔ان کے نزدیک سچی محبت شور نہیں کرتی بلکہ اپنے وجود سے دوسروں کی زندگی کو روشن کرتی ہے۔وہ کہتے ہیں:

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا اگر گلے نہیں ملتا تو ہاتھ بھی نہ ملا

اس شعر میں شاعر محبت کی اخلاقیات کو بیان کرتا ہے۔وہ تعلقات میں تصنع، مفاد پرستی اور منافقت کو مسترد کرتے ہوئے اخلاص کو اصل قدر قرار دیتا ہے۔یہاں محبت صرف جذباتی وابستگی نہیں بلکہ کردار کی سچائی اور انسانی دیانت کا استعارہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ بشیر بدر کے یہاں اخلاقی شعور اور جمالیاتی حسن ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔بشیر بدر کے عشق میں انتظار بھی ہے،مگر یہ انتظار روایتی غزل کی طرح محض محبوب کی آمد کا انتظار نہیں بلکہ اس احساس کا انتظار ہے جس کے ذریعے انسان دوبارہ اپنی داخلی دنیا سے آشنا ہو سکے۔ان کی شاعری میں محبوب کبھی ایک فرد ہوتا ہے،کبھی ماضی،کبھی خواب اور کبھی وہ گم شدہ سکون جس کی تلاش جدید انسان مسلسل کرتا رہتا ہے۔ان کے کئی اشعار میں محبت یاد کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔یاد ان کے یہاں محض ماضی کی بازیافت نہیں بلکہ حال کی اداسی کا حوالہ بھی ہے۔اس لیے ان کی غزل میں ماضی ہمیشہ حال کے ساتھ مکالمہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔یہی خصوصیت ان کی شاعری کو جذباتیت سے نکال کر فکری گہرائی عطا کرتی ہے۔

تنقیدی اعتبار سے دیکھا جائے تو بشیر بدر کی محبت کا تصور میر تقی میر کی داخلی سوز و گداز سے مختلف ہے۔میر کے یہاں عشق فرد کی مکمل شکست کا استعارہ بنتا ہے،جبکہ بشیر بدر کے ہاں محبت شکست کے باوجود انسان کو امید سے وابستہ رکھتی ہے۔اسی طرح مرزا غالب کی طرح وہ فلسفیانہ پیچیدگی اختیار نہیں کرتے، بلکہ روزمرہ زندگی کے سادہ تجربات سے ایسے معنی پیدا کرتے ہیں جو ہر طبقے کے قاری تک پہنچ جاتے ہیں۔ان کی شاعری میں محبت کا ایک اور اہم پہلو احترامِ انسانیت ہے۔وہ محبت کو صرف دو افراد کے درمیان تعلق نہیں سمجھتے بلکہ اسے معاشرتی ہم آہنگی کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔اسی لیے ان کے اشعار میں نفرت،تعصب اور خود

غرضی کے مقابلے میں محبت ایک اخلاقی مزاحمت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے نزدیک محبت انسان کو نرم خو، باوقار اور باکردار بناتی ہے، جبکہ نفرت انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ بشیر بدر کی غزل کا کمال یہ ہے کہ وہ محبت کے پیچیدہ احساسات کو نہایت سادہ زبان میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ثقیل الفاظ یا مصنوعی صنعت گری نہیں ملتی، مگر اس کے باوجود ہر شعر اپنے اندر کئی تہیں رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری عام قاری کو بھی متاثر کرتی ہے اور سنجیدہ ناقد کو بھی غور و فکر پر مجبور کرتی ہے۔

اس تمام تجزیے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بشیر بدر نے محبت کو روایتی رومانویت سے نکال کر جدید انسانی زندگی کے ایک ہمہ گیر تجربے میں تبدیل کر دیا۔ ان کے ہاں عشق صرف محبوب کی جستجو نہیں بلکہ اعتماد، اخلاص، تہذیب، یاد اور انسانی وقار کی بازیافت کا نام ہے۔ یہی ان کی شاعری کی سب سے نمایاں ادبی جہت ہے، جس نے جدید اردو غزل کو ایک نئی فکری وسعت عطا کی۔

بشیر بدر کی شاعری میں تنہائی، ہجرت اور جدید انسان کا المیہ: بشیر بدر کی شاعری کا ایک نہایت اہم اور منفرد پہلو جدید انسان کی داخلی تنہائی اور وجودی اضطراب کا بیان ہے۔ اگرچہ ان کی غزل کا پہلا تاثر محبت اور رومان کا معلوم ہوتا ہے، لیکن گہرائی میں اترنے پر احساس ہوتا ہے کہ ان کی اصل شاعری انسان کی اس داخلی شکست کا نوحہ ہے جو جدید تہذیب کی تیز رفتار زندگی، بدلتے ہوئے سماجی رویّوں اور رشتوں کی بے ثباتی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ ان کے یہاں تنہائی کوئی وقتی کیفیت نہیں بلکہ ایک مستقل وجودی تجربہ ہے، جو انسان کو خود اپنے وجود سے اجنبی بنا دیتا ہے۔

بشیر بدر نے اس عہد کو قریب سے دیکھا جس میں مادّی ترقی نے انسانی آسائشوں میں تو اضافہ کیا، مگر روحانی سکون، باہمی اعتماد اور خاندانی وابستگی کو کمزور کر دیا۔ چنانچہ ان کی شاعری میں بارہا ایسے مناظر ابھرتے ہیں جہاں ہجوم موجود ہے، مگر انسان تنہا ہے؛ گھر آباد ہیں، مگر دل ویران ہیں؛ رشتے قائم ہیں، مگر ان میں حرارت باقی نہیں رہی۔ یہی جدید انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے، جسے شاعر نہایت لطیف پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ بشیر بدر کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

اڑنے دو پرندوں کو ابھی شوخ ہوا میں پھر لوٹ کے بچپن کے زمانے نہیں آتے

بظاہر یہ شعر بچپن کی یاد کا اظہار ہے، لیکن اس کی معنوی جہات اس سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ یہاں "پرندے" آزادی، معصومیت اور امکانات کی علامت ہیں، جبکہ "بچپن" صرف عمر کا ایک مرحلہ نہیں بلکہ انسانی فطرت کی پاکیزگی، بے ساختگی اور بے غرض محبت کا استعارہ ہے۔ شاعر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وقت کا سفر انسان سے وہ تمام نعمتیں چھین لیتا ہے جن کی قدر اسے بعد میں محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح یہ شعر یاد، وقت اور محرومی کے مثلث میں انسانی زندگی کی ایک گہری سچائی کو آشکار کرتا ہے۔

بشیر بدر کی شاعری میں ہجرت کا احساس بھی نہایت نمایاں ہے۔ تاہم ان کے ہاں ہجرت صرف جغرافیائی نقل مکانی نہیں بلکہ ایک روحانی اور تہذیبی کیفیت ہے۔ کبھی انسان اپنے شہر سے بچھڑتا ہے، کبھی اپنے گھر سے، کبھی اپنے لوگوں سے اور کبھی اپنے ہی ماضی سے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں "گھر"، "دروازہ"، "راستہ"، "شہر" اور "کھڑکی" جیسے الفاظ محض اشیا نہیں رہتے بلکہ گہرے علامتی مفاہیم اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کا معروف شعر دیکھیے:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

یہ شعر بشیر بدر کی سماجی بصیرت اور انسانی درد کا بہترین نمونہ ہے۔ "گھر" یہاں صرف اینٹ اور پتھر کی عمارت نہیں بلکہ انسان کے خواب، محنت، یادیں اور شناخت کا استعارہ ہے۔ شاعر ایک طرف تعمیر کے عمل کو انسانی جدوجہد کی علامت بناتا ہے اور دوسری طرف تباہی کی بے حسی کو عصرِ حاضر کی سب سے بڑی اخلاقی شکست قرار دیتا ہے۔ اس شعر کی عظمت اس میں پوشیدہ آفاقیت ہے، کیونکہ یہ ہر اس معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے جہاں طاقت، نفرت یا تعصب کے نام پر انسانی بستیاں اجاڑی جاتی ہیں۔ بشیر بدر کے ہاں تنہائی ہمیشہ مایوسی میں تبدیل نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری میں دکھ کے باوجود امید کی ایک مدھم مگر مسلسل روشنی موجود رہتی ہے۔ وہ انسان کو ٹوٹنے نہیں دیتے بلکہ اسے زندگی کی طرف واپس بلاتے ہیں۔ یہی ان کے فن کی ایک اہم جمالیاتی خصوصیت ہے۔ ان کے نزدیک دکھ انسان کو بے حس نہیں بلکہ زیادہ حساس اور زیادہ باشعور بناتا ہے۔

فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو تنہائی اور ہجرت جیسے پیچیدہ موضوعات کو بیان کرتے

وقت بھی بشیر بدر زبان کو بوجھل نہیں ہونے دیتے۔ وہ فلسفیانہ اصطلاحات یا مشکل استعارات سے گریز کرتے ہیں اور روزمرہ زندگی کے عام الفاظ سے غیر معمولی معنوی وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی ان کے اسلوب کی اصل طاقت ہے۔ قاری ان کا شعر پڑھتے ہوئے محسوس کرتا ہے کہ شاعر اس کی اپنی زندگی کی کہانی بیان کر رہا ہے۔ اگر اس پہلو کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فیض احمد فیض کے ہاں ہجرت اور جدائی اجتماعی سیاسی تجربے سے وابستہ ہو جاتی ہے، جبکہ بشیر بدر کے ہاں یہی احساس زیادہ داخلی، نفسیاتی اور شخصی انداز میں سامنے آتا ہے۔ اسی طرح ناصر کاظمی کی شاعری میں بھی ہجرت اور تنہائی کے گہرے نقوش ملتے ہیں، لیکن بشیر بدر اس کیفیت کو نسبتاً نرم، سادہ اور روزمرہ زبان میں بیان کرتے ہیں، جس کے باعث ان کی غزل عام قاری کے دل تک براہِ راست پہنچ جاتی ہے۔

تنقیدی نقطۂ نظر سے کہا جا سکتا ہے کہ بشیر بدر نے جدید انسان کی تنہائی کو محض ذاتی غم کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ اسے پورے عہد کی تہذیبی علامت بنا دیا ہے۔ ان کے نزدیک اصل سانحہ یہ نہیں کہ انسان اکیلا ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ تعلقات کے درمیان رہتے ہوئے بھی تنہا ہے۔ یہی احساس ان کی شاعری کو محض رومانوی غزل سے بلند کر کے عہدِ حاضر کی ایک معتبر ادبی دستاویز میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یوں بشیر بدر کی شاعری میں تنہائی، ہجرت اور داخلی کرب ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہیں کہ ان کے بغیر ان کی ادبی شخصیت کا مکمل تعارف ممکن نہیں۔ ان کا فن ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا وطن محبت، اعتماد اور یاد ہے، اور جب یہ رشتے کمزور پڑ جائیں تو پوری دنیا آباد ہونے کے باوجود انسان اپنے اندر ایک اجڑا ہوا شہر لیے پھرتا ہے۔

بشیر بدر کو محض رومان کے شاعر قرار دینا ان کے فنی مقام کو محدود کرنے کے مترادف ہے۔ اگرچہ محبت ان کی شاعری کا بنیادی حوالہ ہے، لیکن اس محبت کے پس منظر میں ایک ایسا حساس ذہن موجود ہے جو اپنے عہد کی تہذیبی تبدیلیوں، سماجی رویّوں اور انسانی اقدار کے زوال کو پوری گہرائی سے محسوس کرتا ہے۔ ان کی غزل میں فرد کی داخلی دنیا اور معاشرے کی خارجی دنیا ایک دوسرے سے الگ نہیں بلکہ باہم مربوط دکھائی دیتی ہیں۔ یہی ربط ان کی شاعری کو عصری معنویت عطا کرتا ہے۔ جدید معاشرے میں مادّی ترقی نے انسان کو بے شمار

سہولتیں فراہم کی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ رشتوں کی حرارت، باہمی اعتماد اور اخلاقی وابستگی کو بھی متاثر کیا ہے۔ بشیر بدر اسی تغیر کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ وعظ یا خطابت کا سہارا نہیں لیتے بلکہ ایک مختصر شعر میں پورے معاشرتی منظرنامے کو سمیٹ دیتے ہیں۔ ان کے یہاں سماجی تنقید تلخی سے زیادہ دردمندی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ اس ضمن میں ان کا یہ شعر نہایت اہم ہے:

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

یہ شعر بظاہر انسانی تعلقات کا ایک اخلاقی اصول بیان کرتا ہے، مگر اس کی تہہ میں ایک وسیع سماجی فکر پوشیدہ ہے۔ شاعر اختلاف کو فطری سمجھتا ہے، مگر نفرت کو مستقل رویّہ نہیں بننے دیتا۔ موجودہ معاشرتی فضا، جہاں اختلاف اکثر دشمنی اور انتقام میں بدل جاتا ہے، اس کے تناظر میں یہ شعر نہایت معنی خیز محسوس ہوتا ہے۔ بشیر بدر انسان کو اختلاف کے باوجود انسانیت کا دامن نہ چھوڑنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کا یہ شعر بھی سماجی احساس کی عمدہ مثال ہے:

چراغوں کو آنکھوں میں محفوظ رکھنا بڑی دور تک رات ہی رات ہوگی

اس شعر میں "چراغ" امید، حوصلے اور تہذیبی اقدار کی علامت ہے، جبکہ "رات" ناامیدی، بحران اور اخلاقی تاریکی کی نمائندہ ہے۔ شاعر کا اصرار یہ ہے کہ حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں، انسان کو اپنے باطن کی روشنی کو بجھنے نہیں دینا چاہیے۔ یہی امید بشیر بدر کی شاعری کو محض المیے کی شاعری نہیں بننے دیتی بلکہ اسے زندگی سے وابستہ رکھتی ہے۔ ہر بڑا شاعر اپنے اسلوب سے پہچانا جاتا ہے، اور بشیر بدر کا اسلوب اردو غزل میں اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ ان کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف سادگی ہے، لیکن یہ سادگی سطحیت نہیں بلکہ فنی ریاضت کا نتیجہ ہے۔ وہ پیچیدہ خیالات کو بھی نہایت سہل اور مانوس الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار عام قاری کو بھی متاثر کرتے ہیں اور ناقد کو بھی غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں۔

ان کی زبان خالص ادبی ہونے کے باوجود روزمرہ زندگی سے قریب ہے۔ وہ ثقیل فارسی تراکیب یا غیر مانوس الفاظ کے بجائے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو قاری کی روزمرہ

بول چال کا حصہ ہوتے ہیں، مگر ان کی شعری ترتیب انہیں غیر معمولی جمالیاتی وقار عطا کر دیتی ہے۔ان کے ہاں لفظوں کا انتخاب بے حد محتاط اور بامعنی ہے۔کوئی لفظ اضافی محسوس نہیں ہوتا اور ہر لفظ اپنے سیاق میں مکمل معنوی ذمہ داری ادا کرتا ہے۔بشیر بدر کی شاعری میں علامت اور استعارہ بھی نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں، لیکن ان کی علامتیں پیچیدہ یا مبہم نہیں ہوتیں۔ "گھر"، "چراغ"، "دروازہ"، "شہر"، "بارش"، "راستہ"، "پرندہ" اور" کھڑکی" جیسے الفاظ ان کے ہاں بار بار آتے ہیں، مگر ہر بار نئے مفاہیم کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔یہی ان کی تخلیقی قوت کا ثبوت ہے۔وہ معمولی اشیا کو غیر معمولی معنویت عطا کر دیتے ہیں۔

ان کے اسلوب کا ایک اہم پہلو موسیقیت بھی ہے۔اگرچہ وہ جدید شاعر ہیں، لیکن بحر، آہنگ اور غزل کی کلاسیکی روایت سے ان کا تعلق کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ان کے اشعار پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ لفظ صرف معنی نہیں دیتے بلکہ ایک داخلی نغمگی بھی پیدا کرتے ہیں۔یہی نغمگی ان کی شاعری کو یادگار بناتی ہے۔تنقیدی اعتبار سے اگر ان کے فن کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے روایت سے انحراف کے بجائے اس کی تخلیقی توسیع کی۔ فراق گورکھپوری کی طرح انہوں نے انسانی محبت کو وسعت دی، ناصر کاظمی کی طرح داخلی کرب کو محسوس کیا، اور احمد فراز کی طرح عصرِ حاضر کے انسان سے مکالمہ کیا، مگر ان کی اپنی انفرادیت ان کے نرم لہجے، سادہ زبان اور علامتی اختصار میں نمایاں ہوتی ہے۔ان کے اشعار میں نہ میر کی شدید داخلیت ہے، نہ غالب کی فلسفیانہ پیچیدگی، نہ فیض کا انقلابی آہنگ؛ بلکہ ان کے ہاں ایک ایسا متوازن شعری مزاج ملتا ہے جو محبت، اخلاق، تہذیب اور انسانیت کو ایک ہی شعری دھارے میں سمو دیتا ہے۔

بشیر بدر کی شاعری کی مقبولیت کا راز بھی یہی ہے کہ وہ قاری پر اپنے علم کا بوجھ نہیں ڈالتے بلکہ اس کے احساسات کو زبان دیتے ہیں۔ان کے اشعار زندگی کے عام تجربات سے جنم لیتے ہیں، مگر ان کی معنوی وسعت انہیں غیر معمولی بنا دیتی ہے۔یہی وصف ہر بڑے شاعر کی شناخت ہوتا ہے۔اس تمام تجزیے کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بشیر بدر نے اردو غزل کو زبان، اسلوب اور فکر تینوں سطحوں پر نئی توانائی عطا کی۔انہوں نے ثابت کیا کہ بڑی شاعری کے لیے مشکل زبان یا پیچیدہ فلسفہ ضروری نہیں، بلکہ انسانی تجربے کی سچائی، فنی دیانت اور

اظہار کی لطافت ہی ادب کو دوام بخشتی ہے۔ ان کی شاعری اسی سبب آج بھی نئی نسل کے لیے اتنی ہی تازہ اور بامعنی محسوس ہوتی ہے جتنی اپنے عہد میں تھی، اور یہی ان کی ادبی عظمت کا سب سے مضبوط ثبوت ہے۔

بشیر بدر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ وہ جدید اردو غزل کے ان چند اہم شعرا میں شامل ہیں جنہوں نے روایت کی جمالیاتی روح کو محفوظ رکھتے ہوئے اسے نئے عہد کے فکری اور تہذیبی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی شاعری کسی ادبی تحریک کا نعرہ نہیں بلکہ انسانی احساس، داخلی سچائی اور تہذیبی شعور کی ایسی تخلیقی تعبیر ہے جو قاری کو محض لطفِ سخن ہی نہیں دیتی بلکہ اسے اپنی ذات اور اپنے معاشرے پر غور کرنے کی دعوت بھی دیتی ہے۔ بشیر بدر کی سب سے بڑی ادبی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو مصنوعی جذباتیت اور لفظی آرائش سے نکال کر انسانی تجربے کی صداقت سے وابستہ کیا۔ ان کے ہاں محبت صرف محبوب تک محدود نہیں رہتی بلکہ انسان، معاشرہ، یاد، تہذیب اور اخلاقی اقدار تک پھیل جاتی ہے۔ یہی وسعت ان کی شاعری کو محض رومانوی شاعری سے بلند کر کے فکری اور تہذیبی شاعری کا درجہ عطا کرتی ہے۔

ان کی غزل میں تنہائی، ہجرت، شکستِ خواب، بدلتے ہوئے سماجی رویّے اور رشتوں کی کمزور ہوتی بنیادیں نہایت سادہ مگر مؤثر انداز میں سامنے آتی ہیں۔ وہ جدید انسان کی داخلی بے چینی کو فلسفیانہ پیچیدگی کے بجائے روزمرہ زندگی کی علامتوں کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار ایک طرف عام قاری کے دل میں جگہ بناتے ہیں اور دوسری طرف ناقد کو نئے معنی دریافت کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اسلوب کے اعتبار سے بھی بشیر بدر نے اردو غزل کو نئی جہت عطا کی۔ ان کی زبان سادہ، شائستہ، رواں اور محاوراتی ہے، مگر اس سادگی کے اندر ایک غیر معمولی فنی ریاضت پوشیدہ ہے۔ ان کے اشعار میں علامت اور استعارہ زندگی کے عام مناظر سے جنم لیتے ہیں، اس لیے ان کی شاعری تصنع سے پاک اور حقیقت سے قریب محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ عظیم شاعری مشکل الفاظ یا پیچیدہ تراکیب کی محتاج نہیں بلکہ گہرے انسانی احساس اور تخلیقی صداقت سے جنم لیتی ہے۔

بشیر بدر کے ادبی مقام کا ایک اہم پہلو ان کی عوامی مقبولیت بھی ہے، لیکن یہ مقبولیت

کبھی ان کے فنی وقار پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اردو ادب میں بہت کم شعرا ایسے ہیں جنہیں عوام اور خواص دونوں یکساں احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بشیر بدر انہی خوش نصیب شاعروں میں شامل ہیں۔ ان کے اشعار مشاعروں کی زینت بھی بنتے ہیں، ادبی تنقید کا موضوع بھی، اور عام زندگی کے مختلف مواقع پر بھی زبانِ زدِ عام رہتے ہیں۔ یہ کسی بھی شاعر کی تخلیقی کامیابی کا سب سے مضبوط ثبوت ہے۔ اگر تنقیدی زاویے سے دیکھا جائے تو بعض ناقدین کا خیال ہے کہ بشیر بدر کی شاعری میں بعض اوقات جذباتی عنصر فکری عنصر پر غالب آ جاتا ہے اور بعض موضوعات کی تکرار بھی محسوس ہوتی ہے، لیکن یہ اعتراضات ان کے مجموعی ادبی مقام کو کم نہیں کرتے۔ اس کے برعکس ان کی شعری دنیا کا تنوع، زبان کی تازگی، احساس کی صداقت اور اسلوب کی انفرادیت ان تمام جزوی کمزوریوں پر غالب آ جاتی ہے۔ ہر بڑے شاعر کی طرح ان کے یہاں بھی کچھ اشعار معمول کے درجے کے ہیں، مگر ان کی بہترین شاعری اردو غزل کے سرمایہء افتخار میں ہمیشہ شامل رہے گی۔

بشیر بدر نے اردو غزل کو یہ احساس عطا کیا کہ جدید زندگی کی تمام تر تلخیوں کے باوجود محبت، امید، انسان دوستی اور اخلاقی وقار ہی وہ اقدار ہیں جو انسان کو بکھرنے سے بچا سکتی ہیں۔ ان کی شاعری احتجاج بھی کرتی ہے، مگر تہذیب کے دائرے میں؛ دکھ کا اظہار بھی کرتی ہے، مگر مایوسی پیدا نہیں کرتی؛ اور محبت کی بات بھی کرتی ہے، مگر اسے محض جذباتی واردات نہیں بلکہ انسانی بقا کی بنیاد قرار دیتی ہے۔ اس مطالعے کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بشیر بدر نے اردو غزل کی روایت میں ایک منفرد اور مستحکم مقام حاصل کیا ہے۔ ان کی شاعری روایت اور جدت، سادگی اور گہرائی، جمال اور فکر، ذات اور معاشرہ ان تمام عناصر کا ایسا حسین امتزاج پیش کرتی ہے جو انہیں معاصر اردو شاعری کے نمایاں ترین شعرا میں شامل کرتا ہے۔ آنے والے ادوار میں بھی جب جدید اردو غزل کی تاریخ لکھی جائے گی تو بشیر بدر کا نام ایک ایسے شاعر کے طور پر لیا جائے گا جس نے انسانی احساسات کو نئے عہد کی زبان عطا کی اور غزل کو زندگی کے قریب تر کر دیا۔

کتابیات:

- بشیر بدر۔ آسمان۔ نراج کمل پرکاشن، نئی دہلی، 1991ء۔

•بشیر بدر۔آہٹ۔کتاب نگر،نئی دہلی 1998ء۔
•بشیر بدر۔بس اتنی سی بات۔راج کمل پرکاشن،نئی دہلی 2000ء۔
• گوپی چند نارنگ۔ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی 2002ء۔
شمس الرحمٰن فاروقی۔شعرشورانگیز (جلد چہارم)۔شب خون کتاب گھر،الہ آباد 2006ء۔
•وزیر آغا۔اردوغزل کا مزاج۔سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور 1995ء۔
• آل احمد سرور۔اردوتنقید کے مسائل۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،نئی دہلی 1983ء۔
•محمد حسن قاسمی۔جدید اردو غزل۔الفیصل ناشران،لاہور 1998ء۔
•عابد علی خان۔اردو ادب کی تاریخ۔سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور 2005ء۔
•مولوی عبدالحق،۔اردو ادب کی مختصر تاریخ۔مجلسِ ترقیِ ادب،لاہور مختلف ایڈیشنز۔
•خلیق انجم۔اردو ادب کی تاریخ۔قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان،نئی دہلی 2008ء۔
• بشیر بدر: فن اور شخصیت۔قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (مرتبہ)۔نئی دہلی مختلف ایڈیشنز۔

☆☆☆

Sultan Azad : Hayat-o-Khidmaat by Mohd. Sarfaraz Alam (Research Scholar, dept. of Urdu Lalit Narayan Mithla University,Darbhanga)

محمد سرفراز عالم (ریسرچ اسکالر، شعبہء اردو، للت نارائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ)

سلطان آزاد: حیات وخدمات

صوبہ بہار برصغیر کی تہذیبی، علمی اور ادبی روایت کا ایک اہم مرکز ہے۔ یہ خطہ قدیم زمانے سے ہی علم ودانش، فکر وفلسفہ اور زبان وادب کا گہوارہ رہا ہے، یہاں بڑے بڑے شعرا، ادبا، انشاء پرداز، صحافی، صوفی اور سنت نے جنم لیا، اردو زبان وادب کے ان بزرگوں اور کرم فرمائیوں کو بہار سمیت ملک و بیرونی ملک میں ان کی ادبی کوششوں، علمی کمالات اور فکری بصیرت کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، عہد حاضر کے کرم فرمائیوں نے شمع سے شمع روشن کرنے کی روایت کو باقی رکھا اور اپنے خون جگر سے اردو ادب کی آبیاری کی اور اپنی خدمات کی بدولت اردو ادب میں درخشندہ ستارے بن کر نمودار ہوئے، اسی زرخیز زمین پر کچھ ایسے باوقار معلم بھی ہیں جنہوں نے شہرت ومقبولیت کی پرواہ کئے بغیر ادبی کاوشوں، علمی صلاحیتوں اور فکری بصیرت و دور اندیشی سے اردو ادب کے خزانے میں گراں قدر اضافات کئیا ور تحقیق و تنقید کا کام اتنی یکسوئی، انہماک اور جنون کے حد تک کیا کہ ادبی حلقوں میں نہ صرف سراہنیے ہوئے بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے اور شہرت مقبولیت کے ساتھ بلند مقام بھی حاصل کئے۔ ایسے ہی مشاہیر قلم کاروں اور خامہ فرسائیوں کی فہرست میں ایک اہم اور معتبر نام عالی جناب سلطان آزاد کا بھی ہے، جن کا اسم گرامی جدید تحقیق وتنقید کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں، ان کی جہد مسلسل اور سعی پیہم کا معترف خاص وعام ہے۔ سلطان آزاد ان چنیدہ قلم کاروں میں ہیں جن کی عزت نفس، خودداری، اعلی ظرفی، خوش اخلاقی، شائستگی، منکسر المزاجی، خاکساری اور متوازن طبیعت پر نہ صرف سرنگوں بلکہ قلب وجگر بھی پست ہوجاتا ہے، بقول ڈاکٹر فیضان حیدر

جنہیں بارہاان سے ملاقات اور گفت وشنید کا شرف حاصل ہوا ہے:

بہ ظاہر وہ مناسب ڈیل ڈول کے آدمی ہیں۔ پروقار تمکنت چہرے پر نمایاں ہے۔ بہت سنجیدگی سے گفتگو کرتے ہیں، اس کے باوجود خوش باش ظریف الطبع اور عالی ظرف ہیں۔ چونکہ علم و ادب میں شغف ہے اس لیے جب بھی ان سے ملنے کا موقع میسر آئے علمی وادبی موضوعات پر ہی گفتگو ہوئی۔ رواج زمانہ کے برخلاف ادھر ادھر کی باتیں کرنے میں ان کا جی نہیں لگتا اور اس قسم کی گفتگو سے پرہیز کرتے ہیں۔

(بحوالہ کتاب سلطان آزاد شخص اور عکس، مرتب ڈاکٹر فیضان جعفر علی صفحہ 14)

آپ 2/ جولائی 1958 کو پٹنہ سٹی کے گلزار باغ کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مذہبی اور ابتدائی تعلیم والدہ ماجدہ سے حاصل کی، لیکن کلام پاک اور دیگر مذہبی تعلیم کی تکمیل مولوی حبیب صاحب مرحوم کے یہاں ہوئی، میٹرک (بہار اگزامنیشن بورڈ پٹنہ) آئی۔اے اور بی۔اے (مگدھ یونیورسٹی) ایم۔اے اردو (نالندہ یونیورسٹی) سے کیا۔آپ کا اصل نام محمد سلطان، قلمی نام آزاد، والد صاحب کا نام محمد عثمان اور والدہ ماجدہ کا نام حلیمہ خاتون ہے۔1983 میں شادی ہوئی، اہلیہ کا نام حمیدہ خاتون ہے، دولڑکے: شہزاد احمد اور شاہنواز احمد اور دولڑکیا: شائستہ اور شہناز بانو ہیں، ادب کا شوق کم سنی سے ہی تھا، کتب بینی، مطالعہ اور تحقیق و جستجو میں مصروف ومشغول رہناان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ بہت مصروف زندگی گزارنے کے باوجود کبھی تحقیق و مطالعہ سے منہ نہیں موڑے، بلکہ خاموشی، یکسوئی اور انہماک کے ساتھ منزل کی طرف عازم سفر رہیں۔آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مختلف قسم کے سماجی، اخلاقی، تاریخی اور مذہبی مضامین سے کیا پھر نثری ادب میں طبع آزمائی کی، آپ نے تحقیق وتنقید، فن افسانہ اور بچوں کے ادب میں بیش بہا جوہر دیکھایا، لیکن آپ کی شناخت تذکرہ نویس اور تحقیق و تنقید کی وجہ سے قائم ہوئی۔آپ کی شرافت نفس، گھریلو ذمہ داریوں اور ملازمت کی باوجود علم و ادب کی مسلسل جدوجہد کے حوالے سے جناب احمد بدر لکھتے ہیں:

متوسط طبقہ کے انسان ہیں، وہ طبقہ جس کی سب سے بڑی دولت اس کی شرافت ہوتی ہے، یہ شرافت نہ ہاتھ پھیلانے دیتی ہے، نہ چھوٹے موٹے کام کرنے دیتی ہے سفید پوش کا بھرم بھی قائم رکھنا پڑتا ہے۔مردم شماری کے محکمے میں کء سال تک کام کیا پھر سرکار نے

ملازمین کی ایک بڑی تعداد کو سڑک لا کر بے پناہ چھوڑ دیا۔ کء برسوں کی مسلسل اور مستعدی سے بھری جہد مسلسل کے بعد ان لوگوں کے حق میں فیصلہ ہوا اور اس کے بعد بھی لمبی لڑائی کرنی پڑی تب جا کر پرائمری اسکول کی ملازمت کے اہل سمجھے گئے۔

(بحوالہ کتاب سلطان آزاد شخص اور عکس صفحہ نمبر 15)

ادبی ذوق: آپ کے ادبی ذوق کی شروعات کی وجہ دو رسالے: ماہنامہ "شمع" اور" روبی" دہلی محرک ہوئے اور ان دونوں رسالے کے سبب آپ نے اپنی ادبی سفر کا آغاز کیا۔ آپ اپنی ادبی سفر کے متعلق خود ہی رقم طراز ہیں:

" میرے ادبی سفر کو صفحہ قرطاس پر لانے میں دو نیم ادبی رسائل ماہنامہ " شمع" اور" روبی" دہلی محرک ہوئے ۔۔ افسانے کی دلچسپی اور لکھنے کی ترغیب وتحریک ان دونوں رسائل" شمع" اور " روبی" سے ہی ملی۔"

(مضمون: میرا ادبی سفر، سہ ماہی اصناف ادب صفحہ 21 اکتوبر تا دسمبر 2020)

آپ قلم فرسائی کا باضابطہ آغاز 1977 سے کئے، ابتدائی دور میں مختلف قسم کے اور رنگا رنگ مضامین لکھے، ان میں سیاسی، مذہبی، تکنیکی اور ادبی مضامین لکھے۔ آپ کی ادبی سفر میں انجمن سے وابستگی بھی ہے۔ رمز عظیم آبادی کی ایماء و اشارے پر ادبی انجمن بنام" پرویز شاہدی" پٹنہ میں بحیثیت سکریٹری نشر واشاعت بنے اور بعد میں ادبی انجمن کا جنرل سیکرٹری بھی بنا دیے گئے۔ مذہبی انجمن محمدیہ پٹنہ سٹی بہار (رجسٹرڈ) کے ایک رکن بھی رہے۔ صحافت کے تحت روزنامہ ایثار، پٹنہ سے وابستگی بھی رہی۔ آپ اپنی ادبی سفر سے متعلق لکھتے ہیں:

" میں نے گزشتہ تقریباً چار دہائیوں سے لکھنے پڑھنے کا ذوق وشوق پیدا کیا اور 1977 سے باضابطہ لکھنا شروع کیا ہے۔ شروع ہی میں مختلف نوعیت کے مضامین لکھے، ان میں سیاسی، مذہبی اور تکنیکی کے ساتھ ادبی مضمون بعنوان" ہندوستان کی مقبول ترین زبان اردو" شائع کیا۔"

(مضمون میرا ادبی سفر: سہ ماہی اصناف ادب مظفر پور صفحہ نمبر 21 اکتوبر تا دسمبر)

سلطان آزاد کثیر الجہات شخص ہیں، گوں نا گوں نوعیت میں طبع آزمائی کی ہے۔ افسانہ، افسانچہ، ڈرامہ، فیچر، رپوتاژ، انٹرویو، سفرنامہ، خاکہ، ادب اطفال میں بچوں کے لیے کہانیاں جیسے افسانوی اور غیر افسانوی صنف ادب میں اپنی نوعیت کا اظہار کیا ہے، لیکن

آپ کی دلچسپی خصوصی طور پر تحقیق وتذکرہ اور تنقید سے ہے۔آپ کی مختلف نوعیت کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر منظر اعجاز لکھتے ہیں: " سلطان آزاد کی ادبی اصطبل کا درس قلم کسی ایک گھونٹے سے بندھا ہوا نہیں ہے اور چراگاہ ادب میں بھی اس کی چوکڑیوں کی کوئی معین اور مقرر سمت ورفتار نہیں ہے۔(سب رس حرف اعجاز از ڈاکٹر اعجاز)

سلطان آزاد کی ادبی کاوش: آپ کی کم وبیش پندرہ کتابیں ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔آپ کی پہلی کاوش" دبستان عظیم آباد"1982 میں نکھار پبلیکیشنز،مئوناتھ بھنجن یوپی سے شائع ہوئی،اس کتاب میں عظیم آباد کے تقریباً110 شعرا،ادبا،ناقدین،محققین اور افسانہ نگاروں سے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے،دبستان عظیم آباد میں منظومات اور منثورات کے صفحے الگ الگ ہیں۔منثورات میں مضمون نگاروں اور افسانہ نگاروں کو احاطہ کیا گیا ہے،2019 سے کولہان یونیورسٹی جھارکھنڈ کے شعبہ ایم۔اے اردو کے نصاب کا حصہ ہے۔

سلطان آزاد کی تصنیف" دبستان عظیم آباد" کے متعلق ابوالکلام رحمانی (کولکاتا) اظہار خیال کرتے ہیں کہ دبستان عظیم آباد میں سلطان آزاد نے جس دیدہ ریزی سے کام لیا ہے اور جتنی محنت کی ہے اس کا صلہ انہیں اس صورت میں ملے گا کہ تاریخ ادب میں ان کا نام ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجائے گا۔(مطبوعہ یوم جمہوریہ،ہفتہ وار ایک قوم 1984)

" تلاش وتجزیہ "2000ء پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج پٹنہ سے شائع ہوئی۔اس کتاب میں عظیم آباد نیز دیگر علاقوں سے وابستہ ادبا،شعرا،ناقدین،مصنفین،افسانہ نگار اور مزاح نگار کی ادبی خدمات سے روشناس کرایا گیا ہے۔" شعور کی رو" ادبی مضامین پر مشتمل سلطان آزاد کی گراں قدر تصنیف ہے،2017 میں پاکیزہ آفسیٹ شاہ گنج پٹنہ سے شائع ہوئی۔120 صفحات پر محیط اس کتاب میں مختلف نوعیت کے 10 مضامین" نقد ونظر" کے تحت 4/تبصرے اور سابقہ کتاب" سب رس" سے متعلق اہل علم اور دانشوروں کی آرا کے چند اقتباسات درج ہیں۔

اس کتاب میں پہلا مضمون ڈاکٹر مناظر حسین عاشق ہرگانوی کا" گفتی" کے عنوان سے ہے،اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں،ان میں پہلا مضمون" بہار میں اردو طنز وظرافت: آغاز و ارتقا" ہے،جس میں بہار میں طنز وظرافت کے آغاز سے اب تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔دوسرا مضمون" سرسید کی تحریک کا مینارِ علم: محمدن اینگلو عربک اسکول اور اس کے تابندہ ستارے۔

تیسرا مضمون "احمد جمال پاشا: بحیثیت مزاح نگار" ہے۔ چوتھا مضمون "ضیاء کی شاعری کا قلبی آئینہ معشوق" ہے۔ پانچواں مضمون "عوام کا پسندیدہ شاعر: ساحرلدھیانوی" ہے۔ بیچ میں اور بھی ک ءمضامین ہیں،سب سے آخری مضمون " ناصر زیدی: ادیب گر" ہے۔ اس مضمون کو عالی جناب سلطان آزاد نے اپنے استاد محترم ناصر زیدی کیلیے خراج عقیدت کے طور پر لکھا ہے۔2018 سے 2019 کے درمیان تحقیقی وتنقیدی،تخلیقی اور تبصروں پر مشتمل مضامین کا ایک اور مجموعہ مکمل ہوا جو" ادبی جہتیں" کے نام سے 2019 کے اخیر میں روشان پرنٹرس دہلی سے شائع ہوئی۔ 168 صفحات پر مشتمل ہے۔ انتساب: دبستان عظیم آباد کے نام،جن سے میری ادبی پہچان ہوئی۔ اس کتاب کا آغاز نیاز فتحپوری کے دلکش " گفت باہمی" سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے سلطان آزاد کے فکروفن پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد" اپنی بات" کو جگہ دی گئی ہے۔ اس میں دو اہم تحقیقی مضامین " دبستان انیس اور ان کے تلامذہ" اور" تلامذہ انیس کی مرثیہ نگاری" کی شمولیت کو دانشوران علم وادب نے کافی پسند کیا، یہ دونوں مضامین ملک کے مؤقر رسالے " فکروتحقیق " دہلی اور" آجکل" دہلی میں شائع ہوئے۔ اس کتاب کے آخر میں" سب رس اور شعور کی رو" سے متعلق اہل علم اور دانشوروں کی آراء کے چند اقتباسات بھی شامل ہیں۔" بہار میں رثائی ادب: آغاز وارتقا" 2020 میں روشان پرنٹرس دہلی شائع ہوئی۔ سلطان آزاد کی اہم تصنیف ہے۔ 152 صفحات اور 93 رثائی شعرا کے احوال وآثار اور کلام پر محیط ہے۔ اس کتاب کا اجرا علمی مجلس کے زیراہتمام گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ میں ہوا،اس کتاب کی مقبولیت کی بدولت سلطان آزاد کو بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کا موقع ملا۔ کتاب کے فلیپ پر ڈاکٹر فیضان جعفر علی کی رائے، ڈاکٹر محسن رضا رضوی کے قلم سے پیش لفظ ہے،اس کے بعد مصنف کی" اپنی بات "اور ایک مضمون "بہار میں رثائی ادب: آغاز وارتقا" ہے۔" بہار میں رثائی ادب: آغاز وارتقا" کے متعلق ثناء اللہ ثنا رقم طراز ہیں:

" سلطان آزاد اپنے موقف کی حمایت میں ٹھوس دلائل و براہین لیکر آتے ہیں،جن سے ان کی تحریر کی معتبریت کے ساتھ ساتھ امتیازی شان بھی قائم رہتی ہے۔ سلیس انداز بیاں،ثقالت سے کوسوں دور یہ کتاب، بہار میں رثائی ادب کے حوالے سے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔"

(روزنامہ انقلاب 2021)

بہار میں اردو طنز و ظرافت: اس کا دوسرا ایڈیشن بشمول جھارکھنڈ زیر طبع سے آراستہ ہو کر 2021 میں منظر عام پر آیا، 248 صفحات پر مشتمل ہے، 2019 سے بہار کی تمام یونیورسیٹیوں کے شعبہ ایم۔اے میں داخل نصاب ہے۔ انتساب اپنے والدین: حلیمہ خاتون مرحومہ اور محمد عثمان مرحوم کے نام ہے، کتاب کا شروع حصہ منظومات سے تعلق رکھتا ہے، جس میں جوشش عظیم آبادی سے لیکر پرویز اشرف تک 109 شعرا کی شمولیت ہے، اس طرح نثری حصہ میں انجم مانپوری سے کوثر اعظم تک 40 ادباء شامل ہیں، ابتدائی کتاب میں اردو طنز و ظرافت کی مختصر تاریخ بھی پیش کی گئی ہے۔ بہار میں اردو طنز و ظرافت (بشمول جھارکھنڈ) اردو تذکرہ نگار میں ایک بہتر اضافہ ہے، ان کی یہ کوشش رہی ہے کم و بیش طنز و ظرافت نگاروں کا ایک مختصر تعارف کے ساتھ ان کے کلام یا ان کی نثری نمونے کو سامنے رکھ کر ان میں طنز و ظرافت کی پہلوؤں کی عکاسی ہو سکے۔ (تبصرہ: ڈاکٹر کہکشاں پروین صدر شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی، رانچی جھارکھنڈ)

مختلف افسانے جو زیادہ تر ریڈیو پٹنہ کی اردو سروس سے نشر شدہ اور کچھ رسائل میں طبع زاد تھے اسے اور کچھ افسانچوں (منی کہانیاں) جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع شدہ تھے ان سبھوں کا مجموعہ بعنوان " آئینہ آج کا" 2014 میں کلاسک آرٹ پریس دہلی سے شائع ہوئی۔ سلطان آزاد کا افسانوی مجموعہ ہے، 104 صفحات پر مشتمل ہے، انتساب: اپنے دادا حکیم شیخ محمد علی جاں صاحب مرحوم و مغفور کے نام ہے۔ اس کتاب میں 13 افسانے اور 6 مینی کہانیاں ہیں، کتاب کے شروع میں مشہور ادیب مناظر عاشق ہرگانوی کا " گفتنی " کے عنوان سے ایک بسیط مقدمہ ہے۔" سب رس "128 صفحات پر مشتمل ہے۔ انتساب: اپنی شریک حیات، شریک سفر مسز حمیدہ خاتون کے نام ہے۔ اس کتاب کا کوئی مستقل موضوع نہیں ہے، بلکہ 1983 سے 1990 کے درمیان سلطان آزاد مختلف ادبی انجمنوں سے وابستہ رہے، اس اعتبار سے کئی مشاعروں، نشستوں کے رپورتاژ لکھے کچھ ریڈیو پٹنہ کیلیے فرمائشی ڈرامے لکھے، کچھ فیچر بھی لکھے اور ایک انٹرویو بھی نادم بلخی سے لیا ان تمام نثری تخلیقات کا مجموعہ بعنوان" سب رس " 2017 میں روشان پرنٹرس دہلی سیشائع ہوئی۔

" سانچ کو آنچ نہیں" 2001 میں نورانی پریس مالی گاؤں سے شائع ہوئی۔ بچوں کی طبع زاد کہانیوں کا ایک مختصر مجموعہ ہے جو پانچ چھوٹی کہانیوں کے مشمولات ہے، ساری کہانیاں سبق

آموز ہیں۔اس مختصر کتابچہ پر کئ تبصرے اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔قدیم سائنس دانوں کے تذکرے بچوں کے معیار کے مطابق بنام "عظیم سائنس دانوں کی کہانی" لکھے،اسے رحمانی پبلی کیشنز مالیگاؤں (مہاراشٹر) نے 2011 میں شائع کیا۔"تحقیق وتوضیح"ان کی تحقیقی،تنقیدی اور تجزیاتی مضامین کا مجموعہ ہے،جس میں تقریباً18 دستاویزی مضامین شامل ہیں۔2022 میں روشان پرنٹرس دہلی سے شائع ہوئی۔" کعبے پہ پڑی جب پہلی نظر" سفر نامہ ہے، 64 صفحات پر مشتمل ہے، کتاب کا انتساب اپنے رب عزوجل کے نام ہے، کتاب میں مناسک حج، حج کے اقسام، حج کی اہمیت وافادیت بیان کئے گئے ہیں، ان کے بعد سفر حج کے احوال کا تذکرہ کیا گیا ہے۔2023 میں روشان پرنٹرس دہلی سے شائع ہوئی۔ان کے علاوہ اور بھی کئ ادبی کام زیر قلم ہے، گویا ابھی بھی ادبی سفر جاری وساری ہے۔

☆☆☆

Musharraf Alam Zauqi ke Novelon mein Asri Shaoor aur samaji Haqeeqat Nigari by Shakeel Ahmed (Research Scholar,dept. of Urdu, BGSBU, Rajouri) cell-9086796469

شکیل احمد(ریسرچ اسکالر،شعبہء اردو، باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری)

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں عصری شعور اور سماجی حقیقت نگاری

تعارف:۔ اُن کا پورا نام مشرف عالم ذوقی تھا۔ ان کی پیدائش 24 مارچ 1962ء کو آرا میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام مشکور عالم بصیری تھا اور ان کی والدہ کا نام سکینہ خاتون تھا۔ جو 1983ء میں وفات پا گئی۔مشکور عالم بصیری کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں جن میں سے ذوقی ان کی پانچویں اولاد تھی۔مشرف عالم ذوقی ایک پڑھے لکھے خاندان سے تھے۔ابتدائی تعلیم کی شروعات شاہ آباد اردو سے 1968ء میں کی۔جین اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔بی اے سائنس مضامین کے بجائے آرٹس کے ساتھ 1982ء میں مہاراجہ کالج سے کیا۔ اور پھر بعد میں ایم اے کی ڈگری کی،مشرف عالم ذوقی کی شادی 1992ء میں تبسم فاطمہ سے ہوئی۔ وہ ایک اچھی افسانہ نگار، شاعرہ اور ڈرامہ نویس تھی۔مشرف عالم ذوقی کا انتقال 19 اپریل 2021ء کو کرونا وبا کے سبب ہوا۔ان کی بیوی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور یہ بھی ذوقی کی وفات کے اگلے دن 20 اپریل 2021ء کو وفات پا گئیں۔

(الماس فاطمہ گفتگو بند نا ہو ص 32)

ذوقی صاحب:۔ میں آپ کا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں غیاث الرحمن صاحب کہ جامعہ ریڈیو کی بزم میں آپ نے مجھے شامل کیا اور انٹرویو کے لیے مدعو کیا۔دیکھیے میری زندگی بہت اُلجھی ہوئی رہی ہے پہلے ایک گھر تھا۔ جو کوٹھی کہلاتا تھا 24 مارچ 1962ء کو میری پیدائش ہوئی۔شعور میں آنے کے بعد اس بات کا احساس ہوا کہ یہاں ایک بند بند سا ماحول ہے۔اور اب گھر سے باہر نہیں جا سکتے تو کتابیں دوست بن گئیں۔ بہت چھوٹی عمر میں سے ہی لکھنے پڑھنے کا سلسلہ شروع

ہو گیا۔ میں ایک اور دلچسپ بات آپ کو بتانا چاہوں گا۔ کہ اس زمانے میں اگر کرکٹ کھیلنے کی خواہش ہو تو آپ گھر میں کھیلو، فٹ بال کھیلنا ہو تو گھر میں کھیلے۔ یہاں تک کہ بہت چھوٹے چھوٹے گیمز۔لیکن ایک عجیب بات تھی کہ میں ہر گیمز میں ہار جاتا تھا۔

جی آر سید: اچھا۔

ذوقی صاحب: فٹ بال کھیلا ہار گئے۔ دوسرے لوگ بال لے کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ کرکٹ کھیلنے کی شروعات ہوئی وہاں بھی ہار گئے اور آخر میں پریم چند کی، ایک بات مجھے یاد آئی مجھے احساس ہوا کہ قلم کی ذمہ داری نبھائی جاسکتی ہے۔ اور پھر میں نے اپنے آپ سے کہا۔مشرف عالم ذوقی اب نہیں ہارنا ہے۔ اب صرف جیتنا ہے۔

فکشن کی دنیا میں جن لوگوں نے اپنا یقین قائم کیا ہے۔ ان میں سے ایک نام مشرف عالم ذوقی کا بھی ہے۔ ذوقی کا شمار ایسے قلم کاروں کے ساتھ ہوتا ہے جنہوں نے ظلم کے خلاف بنا کسی ڈر سے اپنی آواز کو بلند کیا ہے۔مشرف عالم ذوقی نے سماجی مسائل، غریبوں کے ساتھ ناانصافی، جھگڑے عورتوں کے مسائل اور ان کی مشکلات وغیرہ کو ایک ایک موضوعات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔مشرف عالم ذوقی اپنے ناولوں میں ہر ایک موضوع کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ اور پڑھنے والوں کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔مشرف عالم ذوقی موجودہ دور کے ناول نگاروں میں کافی زیادہ بہتر ہیں۔ ان کے بہت سارے ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ذوقی کہتے ہیں لوگ زیادہ جھوٹ لکھتے ہیں سچ نہیں لکھتے جو معاشرے میں ہو رہا ہے اسے بھی نہیں لکھتے ذوقی نے یہ بات بیان کی ہے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں میں اس سے کبھی مُنہ نہیں چھپاؤں گا۔

مشرف عالم ذوقی نے یہی بات کیٔ ہے۔مشرف عالم ذوقی نے جو ہمارے سماج میں ہو رہا ہے وہ سب کچھ موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے ناولوں میں عصری شعور اور سماجی حقیقت نگاری کا سچ بھی موجود ہے۔مشرف عالم ذوقی نے عصری شعور اور سماجی حقیقت نگاری کو بہتر انداز میں پیش کیا ہے۔مشرف عالم ذوقی کے ناولوں میں سماجی برائیوں مزدوروں پر ظلم، پولیس کی زیادتیوں، عورتوں کی خاموشی اور سماج میں ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔مشرف عالم ذوقی نے 13 ناول لکھے ہیں اور سات افسانوی مجموعے

اس کے علاوہ ڈرامے اور فلموں میں بھی کام کیا ہے۔ ان کے مشہور ناول "عقاب کی آنکھیں، "نیلام گھر، "شہرِ چُپ ہے، "ذبح"، "پوکے مان کی دنیا"، "پروفیسر ایس کی عجیب داستان"، "لے سانس بھی آہستہ"، "نالہ شب گیر" اور "مردہ خانے میں عورت" وغیرہ اہم ہیں۔

ناول "عقاب کی آنکھیں":۔ یہ ناول 1979ء میں لکھا گیا یہ ناول 17 سال کی عمر میں تحریر کیا۔ یہ ناول 1990ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس ناول کا موضوع سماجی ناانصافی اور بدلتے ہوئے معاشرے کی سچائی کو بیان کیا ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے اس کہانی کو ترتیب اور تسلسل کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ انہوں نے الگ الگ واقعات کو کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ جس میں واقعات اور کرداروں کے درمیان تعلق رہتا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ بے حد مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے ایک بارہ سالہ بچے کی ذہنی کیفیات کو بیان کیا ہے۔ ذوقی نے انسانی فطرت کو بڑے انداز میں بیان کیا ہے کہ جنسی جذبات کا عمل جس طرح انسانوں میں موجود ہے۔ اس طرح سے یہ چرندوں، پرندوں اور حیوانوں میں بھی موجود ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے اس ناول کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں جو الف ہے وہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ بہت چھوٹی سی عمر میں یہ انسانی عمل کو دیکھ کر نفرت کرنے لگتا ہے اور یہ نفرت اس کی ذہنی بیماری بن جاتی ہے۔ الف ہر کسی انسان سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ گھر میں بھی باپ، ماں، بھائی، بہن، کزن وغیرہ جو جو جنسی خواہش رکھتے تھے یعنی مرد اور عورت جنسی تعلق رکھتے تھے۔ ان سب سے نفرت کرتا تھا۔

ایک دن پاپا کو خط لکھتا ہے اور کہتا ہے میں جارہا ہوں کس لیے جارہا ہوں یہ وجہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ بس یہی سمجھ لو کہ میں جارہا ہوں مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرے اگر میں مل بھی گیا تو پاگلوں کی طرح ملوں گا جو زندگی بھر ٹھیک نہیں ہوسکوں گا۔ دوسرے حصے میں الف گھر سے بھاگ کر جوگیوں کے ساتھ جنگل میں چلا جاتا ہے اور سنیاسی اور جوگی بھی وہی عمل دہراتے ہیں جس کی وجہ سے یہ گھر چھوڑ کر آیا تھا اور پھر ان سے دور جنگل کے بڑے گھنے درختوں میں رہتا ہے۔ اور وہاں بھی ایک نر اور مادہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ وہی عمل دہراتے ہیں یہ منظر دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ جانور بھی یہی عمل دہراتے ہیں اب اس کو سمجھ آتا ہے کہ جسم میں ہی سکون ہے اور واپس گھر جاتا ہے۔ اس طرح یہ ناول مشرف عالم ذوقی نے

بیان کیا ہے۔

ناول نیلام گھر:۔ مشرف عالم ذوقی کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ناول 1980ء میں لکھا گیا اور بارہ سال بعد 1992ء میں دہلی سے شائع ہوا۔اس ناول کا موضوع آزادی کے پہلے اور آزادی کے بعد کے فساداور دنگے وغیرہ کومشرف عالم ذوقی نے بیان کیا۔اس ناول میں پولیس کے ظلم و زیادتی اور ہمارے معاشرے میں امیر لوگ غریبوں پر جوظلم کر رہے ہیں اس کو بیان کیا ہے ذوقی نے، اور کہیں ہمارے معاشرے کے پچھڑے ہوئے گروہ کی بے کسی اور بے بسی بھی دیکھنے کوملتی ہے۔ کہیں بے گناہوں کا خون کیا جاتا ہےاور کہیں بارعورتوں کی عزت پر بار بارکھیلا جاتا ہےہمیں ہمارے معاشرے میں بہت ساری برائیوں کا ذکربھی دیکھنے کوملتا ہے۔مشرف عالم ذوقی نے اس ناول کا مرکزی کردار کریم بیگ کودکھایا ہےاوران کے والدظفر بیگ جوبسترِ مرگ پر آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ جب ان کومسلم فساد کا پتا چلتا ہےتو کہتے ہیں ہم نے آزادی کی لڑائی اسی لیےلڑی تھی۔اسی پریشانی میں وہ انتقال کرجاتے ہیں۔کریم بیگ کی بیوی کا نام رضیہ ہےاور بیٹے کا نام انجم ہے۔

کریم بیگ دفتر میں کلرک ہوتا ہے دفتر میں ایک باس ہوتا ہے۔اور ایک رحیمو ں چاچا جو بیگ خاندان کا خادم ہے۔اس کی بیٹی سلمہ جوفساد میں غائب ہوجاتی ہےاور کافی دیر بعد بھیک مانگتے مانگتے وہ دفتر میں آتی ہےتو باس اسےنوکری اور رہنے کے لیےایک کمرہ دیتا ہے۔ اور وہ اپنا نام سلمہ بدل کرمس نیلی رکھ دیتی ہےتو باس اس کواپنی ہوس کا شکار بناتا ہےاور پھر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔کریم بیگ اس کی عزت کوبچانے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن اس کا کوئی ساتھ نہیں دیتا مس نیلی کے بعد باس کی دوسری شکار مسز بھٹنا اس کی ہوس کا شکار بنتی ہے۔ اوراس کوبھی موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔کریم بیگ باس کے خلاف بغاوت کرتا ہےاور باس اسےنوکری سے نکال دیتا ہے۔اس موقع پر کریم بیگ کوجیل کا منہ بھی دیکھنا پڑھتا ہےجیل سے واپس آکر مسجد میں پانچ وقت کی نماز پڑھاتے تھےاوران کا بیٹا انجم دوسری طرف سماج میں برائیوں کوختم کرنے پر لگا ہے۔مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول شہرِ چپ ہے:۔ یہ ناول 1988ء میں لکھا اور 1996ء میں شائع

ہوا۔ ذوقی نے اس ناول میں معاشرے کے موجودہ دور کے حالات بیان کیے ہیں۔ مشرف عالم ذوقی نے اس ناول میں ایک ایسے غریب طبقہ کو سامنے لایا ہے جو پڑھے لکھے تو ضرور ہیں مگر بے روزگار ہیں۔ اس ناول میں مشرف عالم ذوقی نے غریبی، بے روزگاری اور لاچاری نابالغ بچوں کا میڈیا کے ساتھ جڑے رہنا اس حال کو بیان کیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار انیل ہے اور اس کا ایک دوست رگھوبیر یہ دونوں کردار بہت ہی زیادہ پڑھے لکھے ہیں اور بے روزگاری کی وجہ سے دونوں اصلاح کرتے ہیں کہ کسی بچے کو اغوا کر کے ان کے گھر والوں سے پیسے لے کر کوئی کاروبار کرتے ہیں۔ یہ دونوں بڑے گھر کی نابالغ بچی مینا کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ یہ لڑکی ان کے ساتھ بڑے آرام کے ساتھ جاتی ہے کیونکہ اس کی پرورش ہی ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں ٹی وی سیریلز اور بازاری رسالے پڑھ کر چاہتی تھی کہ مجھے کوئی لے جائے اور میرے ساتھ محبت کرے اس لڑکی کی حالت دیکھ کر یہ دونوں بہت حیران رہ جاتے ہیں وہ سوچتے ہیں کہ یہ لڑکی ہمارے سے کتنی آگے نکل چکی ہے۔ اور اپنا ارادہ بدل کر رگھوبیر واپس گھر چلا جاتا ہے اور انیل اس کو گھر واپس چھوڑتا ہے اور گھر میں اس کی بڑی بہن انورادھا سے انیل کی شادی ہوتی ہے اور رگھوبیر کی والدہ کا علاج نہ ہونے کی وجہ سے وفات ہوجاتی ہے اور اس کی آپاہج بہن گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ رگھوبیر کی شادی بھی مینا سے ہوتی ہے۔ اس طرح سے یہ دونوں کردار بڑے گھر سے پیسے حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر اپنا اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ اس طرح سے مشرف عالم ذوقی نے اس ناول کے ذریعے بہت سارے مسلمانوں کی بے روزگاری اور سماج میں ان کی غریبی کو سب کے سامنے لانے کی ضرورت محسوس کی۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول "ذبح" ہے:۔ یہ ناول 1990ء میں لکھا گیا اور 1999ء میں پبلشرز کی جانب سے شائع ہوا۔ ناول کا موضوع سماج میں سب سے نچلے طبقے کے لوگ۔ ذوقی نے سماج کے سب سے نچلے طبقے کے لوگوں کے مسائل کو بھی بہادری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ذوقی نے اس بات کو بیان کیا ہے کہ امیر لوگ غریب اور کمزور لوگوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور ان کا حق چھین لیتے ہیں ذوقی کہتے ہیں یہاں ہر ایک انسان کو برابر کے حقوق ملنے چاہیے۔ اگر کوئی غریب آدمی امیر کے گھر کام کرتا ہے۔ تو یہ لوگ ان کا پورا پورا حق مارتے ہیں اور ان کے ساتھ بہت زیادہ ناانصافی کرتے ہیں۔ اس طرح غریب لوگ امیر لوگوں سے ذبح ہوتے ہیں۔ اس

ناول میں ذوقی نے خاص طور پر غریبی اور بے روزگاری کو موضوع بنا کر نچلے طبقے کے لوگوں کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار عبدل سقہ ہے چودھری خاندان میں پانی بھرنے کا کام کرتا تھا۔جب زمانے نے ترقی کی تو چودھری خاندان میں ہینڈ پمپ لگ جاتا ہے۔عبدل سقہ بے روزگار ہوجاتا ہے گھر میں اتنی غریبی کے کارن اس کا بیٹا اشرف چوری کرنے لگتا ہے۔اور وہ باپ کو بھی ساتھ میں شامل کرتا ہے۔جس کی وجہ سے ان کو کئی بار جیل جانا پڑھتا ہے۔مشرف عالم ذوقی کو یہ ناول لکھنے کی ضرورت تب پڑھی۔کہ جب ان کو لگا کہ ہمارے سماج میں کمزور اور غریب لوگوں کو ذبح کیا جا رہا ہے اس ناول میں مشرف عالم ذوقی نے یہ بیان کیا ہے کہ نئی نسل کے جوان لڑکے بے روزگاری کی وجہ سے غلط راستہ اختیار کرتے ہیں۔بے روزگاری کی وجہ سے ہر کوئی مسلمان سرکاری نوکری کی تلاش میں در بدر گھوم پھر رہا ہے۔اس طرح ذوقی نے سماج کی برائیوں کو عام کاری تک پہنچایا ہے۔

ناول پوکے مان کی دنیا:۔ یہ ناول 2004ء میں لکھا گیا اور 2004ء میں پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا یہ ناول 436 صفحات پر مشتمل ہے۔یہ ناول اردو ناولوں میں اکیسویں صدی میں شمار ہوتا ہے مشرف عالم ذوقی کا ناول نئی ٹیکنالوجی، ویڈیو گیمز اور کارٹون کلچر سے بچوں کی ذہنی سوچ معصومیت پر پڑھنے والے گہرے اثرات کو موضوع بنایا گیا ہے۔انٹرنیٹ اور موبائل فون جب تک بچوں کے ہاتھ لگئے ہیں۔تب سے یہ بچے اپنی عمر سے بہت آگے نکل گئے ہیں۔انٹرنیٹ نے ہمارے بچوں کو ذہنی طور پر غلام بنا دیا ہے۔پوکے مان کی دنیا کے ذریعے مشرف عالم ذوقی نے موجودہ دور کے موضوع کی حقیقت پسندانہ تصویر کھینچی ہے۔جس میں آنے والی مشکلیں صاف طور پر دکھائی دیتی ہیں۔انٹرنیٹ اور فون دیکھنے میں ہمارے بچے پچاس یا ستر سال کے لوگوں سے آگے نکل گئے ہیں۔اس انٹرنیٹ اور فون نے ہمارے بچوں کو کہیں کا بھی نہیں چھوڑا۔صرف تباہی اور بربادی کی طرف ہمارے بچے آگے بڑھ رہے ہیں۔ پوکے مان کی ویڈیو سائنس اور کارٹون دور جدید کے بچوں کا بچپن چھین چکے ہیں۔اس ناول کا مرکزی کردار جج سنیل کمار ہے اور ایک بارہ سال کا بچہ روی کنچن ہے۔یہ بارہ سال کا بچہ بہت ہی خطرناک حادثے سے گزرتا ہے بارہ سال کی لڑکی کا ریپ کر دیتا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار جج سنیل کمار بڑی عقلمندی کے ساتھ اپنے ذہن میں سوچتا ہے۔کہ یہ بچہ تو نابالغ بچہ ہے۔

اور یہ قانون کی ساری کتابیں پڑھ کر دفعہ 302 کے تحت اس بچے کو بری قرار دیتا ہے۔اورجج سنیل کمار پورے ہوش کے ساتھ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ دفعہ 302 کے تحت میں اس نئی ٹیکنالوجی اور گلوبلائزیشن کو سزائے موت کا حکم دیتا ہوں۔مشرف عالم ذوقی نے اس کہانی میں بڑی عقلمندی سے ہماری نئی نسل کی تصویر پیش کی ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی:۔ 21ویں صدی کی اردو ناول نگاری میں ایک اہم ناول ہے۔ اور یہ ناول 519 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناول 2005ء میں لکھا گیا اور 2005ء میں ہی شائع ہوا۔ یہ ناول تین حصوں میں ہی بیان کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں احمد علی جو شخص ہے۔اس کی زندگی کا حصہ پیش کیا گیا ہے۔ جو اس نے اپنی زندگی کی بڑی محنت کے ساتھ بنگال نکسل تحریک میں گزاری تھی۔ دوسرے حصے میں پروفیسر صدرالدین قریشی کی شخصیت کو قارئین کے سامنے لایا ہے۔اور تیسرے حصّے میں سونامی کا ذکر ہے۔ پروفیسر ایس کی عجیب داستان میں سمندری لہروں کا ذکر ہے۔ یہ ہمیں موجودہ دور میں دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پروفیسر ایس کی عجیب داستان بڑے اچھے انداز کے ساتھ سب کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔اس ناول میں جو اہم کردار ہیں احمد علی، پروفیسر ایس، پرویز سانیال،آدیتی سانیال،سندیپ وغیرہ وغیرہ ہیں۔

لے سانس بھی آہستہ:۔ مشرف عالم ذوقی کا اہم ترین ناول ہے۔ یہ ناول 2008ء میں لکھا گیا اور 2013ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ اس ناول میں خاندان کے لوگوں کے درمیان ناجائز جنسی تعلقات رکھتے ہیں۔اس ناول کا مرکزی کردار عبدالرحمن کا ردار ہے۔اس کا دوست نور محمد ہے عبدالرحمن کا ردار محبت کو ٹھکرا کر دوسری لڑکی سے شادی کرتے ہیں جس کا نام رقیہ ہے۔

اور دوسری طرف نادرہ عبدالرحمن کا ردار سے بہت محبت کرتی ہے۔ جب عبدالرحمن کا ردار کی شادی ہوتی ہے تو پریشانی کی حالت میں اس کے دوست نور محمد سے شادی کر لیتی ہے اور پھر بہت جلد اس کا انتقال ہوجاتا ہے۔اور اس کی اپاہج بیٹی نگار سے نور محمد جنسی تعلق قائم کر لیتا ہے۔اور اس کو اکثر رونے کے دورے پڑھتے ہیں۔اور یہ ایسے علاقے میں چلا جاتا ہے۔ جہاں مذہب اور اخلاقیات کی باتیں اس کے گاؤں میں سب سے الگ ہیں۔ وہاں کے سارے لوگ اس کی حاملہ بیٹی کو اس کی بیوی سمجھتے ہیں۔ اس طرح سے یہ ناول ہندوستانی

مسلمانوں کی سماجی صورتحال اور معاشرتی کشمکش کا واقعہ بیان کرتا ہے۔

نالہ شب گیر:۔مشرف عالم ذوقی نے بہت ہی بہترین ناول 2015ء میں لکھا گیا یہ مشرف عالم ذوقی کا تاریخی ناول دہلی سے شائع ہوا۔اس ناول کا موضوع عورتوں کے مسائل اور معاشرے میں آزادی اور ان کی خودمختاری آج ساری دنیا کے خلاف آواز بہت زیادہ اونچی ہورہی ہے۔ اور بہت سارے مظاہرے بھی کیے جارہے ہیں مشرف عالم ذوقی نالہ شب گیر کے ذریعے ہندوستان کی مسلم عورتوں میں بھی تبدیلی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں جتنی بھی عورتیں موجود ہیں خاص کر مسلم عورتیں ان کے منہ میں بالکل زبان نہیں ہے۔

سماج میں ان کی زبردستی شادی کرائی جاتی ہے اور یہ ساری عمر پریشانی جھیلتی رہتی ہیں۔آج کے دور میں دنیا بدل گئی ہے اور عورت کو بھی بدلنا ہوگا۔ بڑے بڑے شہروں میں بھی عورت محفوظ نہیں ہے۔وہ کسی سے بھی آزاد ہو کر محبت نہیں کرسکتی۔عورت کی عزت کی بات کہیں بھی ہم کرئے تو نہیں ہے۔ کیونکہ غنڈے کھلے عام قانون کی دھجیاں آڑاتے نظر آتے ہیں۔ عورت نے بھی مرد کو محبت کرنا سکھایا ہے عورت سے کہاں بھول ہوگئی ہے کہ مرد اس پر حاوی ہو گیا ہے۔اور آج بھی عورتیں مرد کی ٹھوکروں پر رہنے پر مجبور ہیں۔اس ناول میں ایک صوفیہ مشتاق جیسی کمزور عورت کو گھر کے مردوں یعنی ماموں، دادا اور کزن کے ہاتھوں جنسی زیادتی کا شکار ہوتی ہے۔اور یہ مردوں سے سخت نفرت کرتی ہے۔اس معاشرے میں ناہید ناز جیسی دلیر عورتوں کی ضرورت ہے۔ جو مردوں کو اپنا غلام بنا کر رکھتی تھی۔اس طرح سے مشرف عالم ذوقی نے اس ناول کو بیان کیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا ناول مردہ خانے میں عورت:۔ یہ بہت ہی اہم ناول ہے۔ یہ ناول 2021ء میں دہلی سے شائع ہوا۔ناول مردہ خانے میں عورت اس کا مرکزی کردار مسیح سپرا ہے اس ناول میں مسلمانوں کے حق کی بات کی گئی ہے۔اس ناول میں جو کردار ہیں وہ معاشرے کے ظلم وستم سے تنگ آکر خود کو مردہ قرار دیتے ہیں اس ناول میں جو مسیح سپرا ہے۔اس کو احساس ہے کہ میں مردہ گھر میں ہوں یہاں کوئی بھی زندہ نہیں ہے۔اور میں بھی مردہ ہی ہوں۔ یہ ناول ہندوستان کے بہت سارے مسلمان لوگوں کی بُرے حالات پر بات کرتا ہے۔

مسیح سپرا جو مرکزی کردار ہے وہ اقلیت کی آواز بن جاتا ہے، یہ موت اور زندگی کی

جدوجہد کے درمیان بہت زیادہ مدد کرتا ہے۔ ذوقی نے اس ناول میں ہندوستانی سماج میں بڑھتی ہوئی برائیوں کو سب کے سامنے لایا ہے۔ اس ناول کا جو انداز ہے وہ تخلیقی اور تحقیقی ہے۔

اگر ہم مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کی بات کریں تو ان کے ناولوں کی زبان بالکل صاف اور آسان ہے۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں بھی بہت ہی اچھا انداز بیان کیا ہے۔ مشرف عالم ذوقی موضوع کی قسم کے اعتبار سے اپنی زبان و بیان کا استعمال کرتے ہیں۔ مشرف عالم ذوقی نے اپنے ناولوں کو بہت ہی سوچ سمجھ کر بیان کیا ہے۔

☆☆☆

Zauq ki qasida nigari : Ek Fanni-o-tajziyati mutalea by Saddam Husain (Reserach Scholar, dept. of Urdu, Banaras Hindu University, Varanasi) cell-8808792793

صدام حسین (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی)

ذوقؔ کی قصیدہ نگاری: ایک فنی وتجزیاتی مطالعہ

(بہادر شاہ ظفر کے تہنیتی قصیدے ''ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی'' کے خصوصی حوالے سے)

اردو قصیدہ نگاری کی تاریخ میں شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کا نام ایک ایسی بلند قامت شخصیت کے طور پر ابھرتا ہے جس نے اس صنف کو لسانی شکوہ، علمی وقار اور تہذیبی حسن سے مالا مال کیا۔ ذوقؔ اس عہد کے سخنور تھے جب مغلیہ سلطنت سیاسی طور پر اپنے زوال کی آخری حدود کو چھو رہی تھی، مگر دہلی کا علمی و ادبی ماحول اپنی پوری توانائی کے ساتھ زندہ تھا۔ ذوقؔ نے قصیدے کو محض ممدوح کی خوشامد کا ذریعہ ہی نہیں بنایا، بلکہ اسے اردو زبان کی وسعتوں کو آزمانے کا ایک معرکہ بھی بنایا۔ ان کا یہ شاہکار قصیدہ، جو انہوں نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی بارگاہ میں عیدِ شوال اور برسات کے غیر معمولی اجتماع پر پیش کیا، ان کی قادر الکلامی کا شاہدِ عدل ہے۔ اس قصیدے کی تشبیب (تمہید) کا آغاز ایک ایسی کائناتی صورتحال سے ہوتا ہے جہاں ساون کی گھٹائیں اور عید کا چاند باہم دست و گریبان ہیں۔ ذوقؔ اس منظر کو ایک رندانہ نشاط میں تبدیل کرتے ہوئے مطلع پیش کرتے ہیں:

ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی　　　برسات میں عید آئی، قدح کش کی بن آئی

یہاں سے ذوقؔ کا تخیل مادی سرحدوں کو پار کر جاتا ہے۔ وہ آسمان پر نمودار ہونے والے ہلال کو محض ایک فلکیاتی حقیقت نہیں سمجھتے، بلکہ اسے ممدوح کی بزمِ عیش کے لیے ایک "ابروئے پُرخم" کا اشارہ قرار دیتے ہیں:

کرتا ہے ہلال، ابروئے پُرخم سے اشارہ　　　ساقی کو، کہ بھر بادہ سے کشتیِ طلائی

ذوقؔ کی جزیات نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ محفلِ مے نوشی کی رنگینی کو بصری پیکروں میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جامِ بلوریں سے چھلکتی شراب کا عکس پینے والے کے

ہاتھوں کو اس طرح حنائی رنگ عطا کرتا ہے کہ حقیقت اور پرتو میں تمیز کرنا مشکل ہوجا تا ہے:

ہے عکس فگن جامِ بلوریں سے مئے سُرخ کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ مے کش کے حنائی

شاعر کا تخیل اس وقت مزید بلند ہوتا ہے جب وہ آسمانی بجلی اور مے نوشی کی کیفیت کو یکجا کرتا ہے۔ کوندتی ہوئی بجلی مے کش کو ساقی کی طرف سے پھینکا گیا تیر محسوس ہوتی ہے جو نشے کی لہر کو مہمیز کر دیتا ہے:

کوندے ہے جو بجلی، تو یہ سوجھے ہے نشہ میں ساقی نے ہے، آتش سے مئے تیز، اڑائی

برسات کی شدت بیان کرتے ہوئے ذوقؔ جس مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں، وہ ان کی خلاقانہ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ بارش کے اس بے پناہ زور کو عناصرِ عالم کے باہمی اختلاط سے تعبیر کرتے ہیں، جہاں آگ اور پانی کے طبقے (کرۂ ناری و مائی) کا فرق مٹ گیا ہے:

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے ہووے نہ ممیز، کرۂ ناری و مائی

اسی طوفانی کیفیت کو ذوقؔ ایک عسکری استعارے میں ڈھالتے ہوئے کہتے ہیں کہ بارش کے ''لشکر'' کی مدد نے معمولی نالوں کو بھی اتنی ہمت دے دی ہے کہ وہ اب دریاؤں پر چڑھائی کرنے کے لیے تیار ہیں:

پہنچا کمکِ لشکرِ باراں سے یہ زور ہر نالے کی ہے، دشت میں دریا پہ چڑھائی

ذوقؔ کی فنکاری یہ ہے کہ وہ فطری مظاہر کو انسانی جذبوں اور حرکات سے منسوب کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک چھوٹی سی ندی کا کنارہ اب سمندر کی حالت پر مسکرا رہا ہے اور تالاب جیسا محدود ذخیرہ بھی ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو آنکھیں دکھا رہا ہے:

ہو قلزمِ عُمّاں پہ لبِ جو، متبسم تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

موسم کی اس تبدیلی نے کائنات کے مادی اثرات کو بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔ ذوقؔ علمی مبالغہ آرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بارش کی کثرت نے ایسی خنکی پیدا کر دی ہے کہ ''جوز'' (اخروٹ) جیسا گرم تاثیر رکھنے والا پھل بھی کافور کی طرح ٹھنڈا ہو گیا ہے:

ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عام یہ سردی کافور کی تاثیر گئی، جوز میں پائی

سردی کا یہ غلبہ انسانی رشتوں اور جذباتی کیفیات کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ذوقؔ کے نزدیک یہ سردی اب اس قدر ہمہ گیر ہے کہ معشوق کے مہندی لگے ہاتھ کی ٹھنڈک

عاشق کے جگر تک اثر کر رہی ہے:

سردیِ حنا پہنچے ہے، عاشق کے جگر تک　　　معشوق کا، گر ہاتھ میں ہے دستِ حنائی

ذوقؔ ہوا کی تندی اور ہیبت کا ذکر کرتے ہوئے کائنات کی سب سے بڑی علامت یعنی ''سورج"'' کو بھی زیرِ اثر دکھاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہوا کا زور ایسا ہے کہ آسمان پر موجود خورشید بھی خوف سے لرزاں ہے اور اس کی آنکھیں تھپیڑوں سے ''ہوائی'' ہو گئی ہیں:

عالم یہ ہوا کا ہے، کہ تاثیرِ ہوا سے　　　گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

یہ تمام پُر شکوہ منظر کشی اور قدرت کا یہ جاہ و جلال دراصل اس عظیم شخصیت کے استقبال کی تمہید ہے جس کی مدح اس قصیدے کا اصل محور ہے۔ ذوقؔ کی قصیدہ نگاری کا یہ حصہ علمی باریکیوں، تخیل کی بلندی اور قدرت کے جمالیاتی سنگھار کا ایک لامتناہی مرقع ہے۔ تشبیب کے اس مرحلے پر شاعر برسات اور عید کی نشاط انگیزی کو مدرسی اور علمی فضاؤں سے جوڑ کر ایک نہایت انوکھا رنگ پیدا کرتا ہے۔ ذوقؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ خشک علمی اصطلاحات کو بھی کیف و سرور کے پیرائے میں بیان کرنے پر قادر ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ خوشی اور طرب کا عالم یہ ہے کہ اب مدرسوں کی سنجیدہ فضا بھی اس سے محفوظ نہیں رہی اور وہاں بھی ''صرفِ ہوائی'' کے چرچے ہیں:

کیا صرف ہوا ہے طرب و عیش کا عالم　　　ہے مدرسہ میں بھی، سبقِ صرفِ ہوائی

شاعر کی فنی جادوگری اس وقت مزید نمایاں ہوتی ہے جب وہ زاہد کی پارسائی اور انگور کی مستی کے درمیان ایک خوبصورت رعایت تلاش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک انگور کی بیلوں میں دانوں کی بہتات نے زاہد کی تسبیح کو بھی ریاکاری سے پاک کر کے اسے انگور کے دانوں جیسی فطری مستی عطا کر دی ہے:

خالی نہیں مے سے، روشِ دانہِ انگور　　　زاہد کا بھی، ہر دانہِ تسبیح ریائی

ذوقؔ کا تخیل مادی اشیاء کو انسانی جذبوں کے تابع دکھاتا ہے۔ وہ عاشق کے دل کو آئینے سے تشبیہ دیتے ہیں جو مینا (شراب کے برتن) کی طرف اس طرح کھنچا چلا جا رہا ہے جیسے مقناطیس گھاس کے تنکے کو اپنی طرف کھینچتا ہے:

جو آئینہِ دل ہے، وہ عاشق کی بغل میں　　　گویا کہ ہے مینا سے، اسے کاہ رُبائی

اس کے بعد قصیدہ ایک نہایت معطر اور رنگین موڑ لیتا ہے جہاں صبا اور نسیم کی آمد گلشن میں ایک نیا

انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ ذوقؔ صبا کو ''مشک فشانی'' اورنسیم کو ''لخلخہ سائی'' (خوشبوبکھیرنے) کی حالت میں دیکھتے ہیں، جیسے کوئی بزمِ شاہی کی آرائش کے لیے عطر پاشی کر رہا ہو:

کرتی ہے صبا آ کے، کبھی مشک فشانی　　کرتی ہے نسیم آ کے، کبھی لخلخہ سائی

بہار کے اس غلبے نے زمین کے نقشے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ذوقؔ کے نزدیک صحرا کا وہ حصہ جہاں کبھی کانٹوں کا فرش بچھا تھا، اب وہاں سبزے نے مخمل کے نہایت قیمتی اور خوش رنگ قالین بچھا دیے ہیں:

تھا سوزنیِ خار کا، صحرا میں جہاں فرش　　سبزہ نے وہاں مخملِ خوش رنگ بچھائی

ذوقؔ کی منظر نگاری یہاں ایک سنگھار دان کی صورت اختیار کر لیتی ہے جہاں کائنات کا ہر ذرہ ممدوح کے استقبال کے لیے خود کو سنوار رہا ہے۔ وہ پھولوں کو انسانی پیکر عطا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قدرت نے نرگس کی شہلائی آنکھوں میں کاجل لگایا ہے اور سوسن کے لبوں پر ''دھڑی'' (سرخی) جمی ہوئی ہے:

ہے نرگسِ شہلا نے، دیا آنکھ میں کاجل　　برگِ گلِ سوسن نے، دھڑی لب پہ جمائی

شاعر کا تخیل یہاں رکتا نہیں بلکہ وہ آسمانی اجسام کو بھی اسی آرائش کا حصہ بنا دیتا ہے۔ وہ سورج کی قوسِ قزح (دھنک) کو بادشاہ کی ابرو کا وسمہ اور شفق کی سرخی کو ممدوح کی حنائی داڑھی قرار دیتا ہے:

ابرو پہ کرے قوسِ قزح وسمہ، تو خورشید　　سُرخیِ شفق سے کرے ریش اپنی حنائی

ذوقؔ کی مبالغہ آرائی میں عسکری اور تہذیبی علامتیں بھی در آتی ہیں۔ وہ پھولوں کے گالوں کی سرخی کو غصے سے بھرے ہوئے تُرکوں کے چہروں سے تشبیہ دیتے ہیں، جو ان کی وسعتِ مطالعہ کا ثبوت ہے:

رُخسارۂ گُل چیں کا ہے، سُرخی سے یہ عالم　　جوں وقتِ غضب، چہرۂ تُرکانِ خطائی

ان کا تخیل اس قدر لطیف ہے کہ وہ ایک سنہری پیالے (ساغرِ زریں) کو ہتھیلی پر جمی ہوئی سرسوں کی طرح بے وزن دکھاتے ہیں، مگر ساتھ ہی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ گلاب کی شاخ اس ہلکے سے پیالے کا بوجھ بھی نہیں اٹھا پا رہی:

کیا ساغرِ زریں کو کیا جلد مہیا　　نرگس نے، تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی

ہوتی متحمّل نہیں، اک ساغرِ گل کی شاخِ گلِ احمر کی، نزاکت سے کلائی

تشبیب کے آخری مرحلے پر ذوقؔ اعجازِ موسیقی اور نغمہ سرائی کا وہ حیرت انگیز نقشہ کھینچتے ہیں جو انسانی عقل کو دنگ کر دیتا ہے۔ان کے نزدیک چمن کے مطرب کا اعجاز یہ ہے کہ گلشن کی ہر شاخ اب نغمہ سرا ہے اور ہر شاخ کی نوک سے شعروادب کی زبان نکل رہی ہے:

اعجازِ نوا سنجیِ مطرب سے، چمن میں ہر شاخ کی ہے نوک، زبانِ شعرونوائی

اور اس منظر کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ دیوارِ چمن پر بنی ہوئی پرندوں کی بے جان تصویریں بھی بہار کے اس فیض سے جاندار ہو کر نغمہ سرائی میں مصروف ہوگئی ہیں:

حیرت کی نہیں جائے کہ دیوارِ چمن پر ہر طائرِ تصویر کرے نغمہ سرائی

یہ تمام تر طلسماتی مناظر، یہ کائناتی سنگھار اور یہ ہوش رُبا مبالغہ آرائی دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ اب بزمِ شاہی کی حدود شروع ہو رہی ہیں اور شاعر اپنے ممدوح بہادر شاہ ظفر کی عظمتِ شان کا قصیدہ پڑھنے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔تشبیب کے رنگین اور طلسماتی ماحول سے نکل کر جب شاعر ممدوح کی بارگاہ میں قدم رکھتا ہے، تو کلام کا لہجہ پرشکوہ اور جاہ و جلال سے بھرپور ہو جاتا ہے۔ذوقؔ بہادر شاہ ظفر کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ عید کی اصل رونق آسمانی چاند سے نہیں، بلکہ بادشاہ کے روئے روشن سے وابستہ ہے۔ان کے نزدیک بادشاہ کا چہرہ وہ حقیقت ہے جس کے سامنے آسمانی چاند محض ایک عکس معلوم ہوتا ہے:

شاہا! ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق عالم نے، تجھے دیکھ کے ہے عید منائی

ذوقؔ کی مبالغہ آرائی یہاں علمی اور فلکیاتی حقائق کو بادشاہ کی ذات میں ضم کر دیتی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ لوگ جسے آسمان پر ''مہِ نو'' (عید کا نیا چاند) کہہ رہے ہیں، وہ دراصل کوئی الگ سے چاند نہیں بلکہ بادشاہ کی بھنوؤں کا عکس ہے جو آسمان کے آئینے میں منعکس ہو گیا ہے:

کہتے ہیں مہِ نو جسے، ابرو نے وہ تیری کی آئینہ چرخ میں ہے عکس نمائی

ممدوح کی عظمتِ شان کا ذکر کرتے ہوئے ذوقؔ اساطیری حوالوں (Allusions) کا سہارا لیتے ہیں۔وہ بادشاہ کی بزمِ عیش کو ایران کے عظیم بادشاہ جمشید کے عہد سے جوڑ دیتے ہیں۔ان کے نزدیک بادشاہ کی موجودگی بزمِ عیش کو وہ جلا بخشتی ہے کہ عام سا جام بھی جمشید کے عالم نما پیالے کی طرح باوقار اور کارگر ہو جاتا ہے:

پرتو سے ترے، جامِ مئے عیشِ سرِ بزم   لے ساغرِ جمشید کرے کارروائی

ذوقؔ کی فنکاری کا ایک نمونہ وہ دعائیہ مبالغہ ہے جہاں وہ بادشاہ کے جام سے ٹپکنے والے ایک معمولی قطرے کو پوری کائنات کا آئینہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک بادشاہ کی عظمت کا یہ عالم ہے کہ اس کے پیالے کے کنارے سے ٹپکنے والا قطرہ اپنی وسعت اور صفائی میں آسمان کی مانند ہے، جس میں پوری خدائی ایک تماشے کی طرح نظر آرہی ہے:

ٹپکے لبِ ساغر سے، وہ قطرہ کہ وہی شکل   ہو مثلِ فلک، جس میں تماشائی خدائی

بادشاہ کی علمی فضیلت کو بیان کرنے کے لیے ذوقؔ ایک ایسی لافانی تمثیل پیش کرتے ہیں جو اردو قصیدہ نگاری کا افتخار بن گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بادشاہ کا علم اس قدر محیط اور وسیع ہے کہ یہ نیلا آسمان بھی اس کے لیے ایک تنگ ظرف کی مانند ہے:

کیا علم سمائے ترا، سینہ میں فلک کے   دریا کی کہاں ہو سکے، کاسہ میں سمائی

یہاں ذوقؔ نے علمِ الٰہیات اور علمِ کلام کی باریکیوں کو بادشاہ کے منصب سے جوڑ دیا ہے۔ وہ بادشاہ کی تخت نشینی کو محض ایک دنیاوی واقعہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک روحانی تقدس عطا کرتے ہیں۔ جب بادشاہ سونے کے تخت پر جلوہ افروز ہوتا ہے، تو ذوقؔ کے نزدیک یہ منظر ایسا ہی متبرک ہے جیسے کسی سنہری رِحل پر قرآنِ پاک رکھا ہو:

یوں کرسیِ زر پر ہے، تری جلوہ نمائی   جس طرح کہ مُصحف ہو، سرِ رِحلِ طلائی

بادشاہ کی سخاوت کا تذکرہ کرتے ہوئے ذوقؔ مبالغے کے اس مقام پر ہیں جہاں کائنات کا سب سے بڑا سخی یعنی ''سمندر'' بھی بادشاہ کے سامنے ایک دستِ نگر بھکاری کی طرح نظر آتا ہے جو اپنی لہروں کی کشتی (کشکول) ہاتھ میں لیے بخشش کا طالب ہے:

رکھتا ہے تو وہ دستِ سخا، سامنے جس کے   ہے بحر بھی کشتی بہ کف، از بہرِ گدائی

عدل و انصاف کی تصویر کشی میں ذوقؔ نے کمالِ سخن دکھایا ہے۔ ان کے نزدیک بادشاہ کے دور میں عدلِ جہانگیری کی وہ فضا قائم ہے جہاں فطری دشمنی رکھنے والی چیزیں بھی ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے سے باز آگئی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ بادشاہ کے عدل نے ہر قسم کی دست درازی کو روک دیا ہے، یہاں تک کہ شمع نے بھی پروانے کو گزند نہیں پہنچائی:

مانع جو ہوا دستِ درازی کو ترا عدل   پروانے کو بھی، شمع نے انگلی نہ لگائی

اسی طرح بادشاہ کی عسکری ہیبت اور تلوار کے جوہر کو وہ ایک حکیمانہ رعایت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ان کے نزدیک تلوار پر موجود ''جوہر'' (لہریں) دراصل وہ زنجیریں ہیں جن میں تلوار مقید ہے تا کہ وہ کسی کا ناحق خون نہ بہا سکے:

زنجیر میں جوہر کے رہے، تیغ ہمیشہ خوں ریز کو ہو عہد میں تیرے نہ رہائی

قصیدے کے آخری حصے میں ذوقؔ ممدوح کی روحانی صفائی اور باطنی نور کا ذکر کرتے ہیں۔ان کے نزدیک بادشاہ کے باطن کی صفائی ایسی ہے کہ اس کے فیض سے ہر پہاڑ ''کوہِ صفا'' بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور ہر بت کے اندر سے حق کا جلوہ نمودار ہو سکتا ہے:

ہر کوہ، اگر کوہِ صفا ہو تو عجب کیا ہو فیض رساں، جب ترے باطن کی صفائی

ہو بلکہ صفا ایسی دلِ سنگِ صنم میں ہر بُت میں کرے، صورتِ حق جلوہ نمائی

شاعر یہاں اپنے ممدوح کے شاعرانہ ذوق کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتا ہے اور شاہی غزل کے ہر شعر کو ''معنیِ بشفا'' (شفا بخش معانی) کا حامل قرار دیتا ہے۔مقالے کے اختتام پر ذوقؔ روایتی طور پر عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے ''دعا'' کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کا ''ذہنِ رسا'' بادشاہ کی رفعتوں تک پہنچنے سے قاصر ہے، لہٰذا اب صرف سلامتی کی دعا ہی وہ آخری نذرانہ ہے جو پیش کیا جا سکتا ہے:

دیتا ہے دعا ذوقؔ کو مضمونِ ثنا میں ہے ذہنِ رسا کو، یہ کہاں اس کی رسائی

ہر سال، شہا! ہووے مبارک یہ تجھے عید تو مسندِ شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

یہ قصیدہ ذوقؔ کی فنی عظمت، لسانی مہارت اور مغل دور کی آخری تہذیبی چمک کا بہترین عکاس ہے۔ اس میں تشبیب کی رنگینی، مدح کا طنطنہ اور دعا کا خلوص مل کر ایک ایسی شعری کائنات تخلیق کرتے ہیں جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔ یہ مقالہ ثابت کرتا ہے کہ ذوقؔ نے قصیدے کو محض ایک درباری صنف کے طور پر نہیں برتا، بلکہ انہوں نے اسے اردو زبان کی فصاحت و بلاغت کا آئینہ دار بنا دیا۔ان کے ہاں مبالغہ آرائی میں بھی ایک علمی منطق، فنی گہرائی اور شعری توازن موجود ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ یہ قصیدہ بہادر شاہ ظفر کے عہد کی ایک ایسی دستاویزی شہادت ہے جو اس دور کے علمی اور جمالیاتی مذاق کی عکاسی کرتی ہے۔☆☆☆

Afsane افسانے

Mutthi,Udaan Asmaan by Vehshi Syed (Srinagar) cell-9419012800

Tajziya by Dr. Jawed Anwar (Varanasi) cell-9935957330

وحشی سعید (سرینگر)　　**تجزیہ: ڈاکٹر جاوید انور**

مٹھی، اڑان، آسمان

مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ مجھ پر یہ حقیقت کب آشکار ہوگئی۔ کہ میری شبیہ آئینے میں نظر نہیں آرہی ہے۔ ایسے اوقات زندگی کا حوصلہ توڑنے والے تو ضرور ہونے چاہئیں، لیکن ہماری گرفت کب اور کہاں تک رہ سکتی ہے ہم پر؟۔۔۔۔۔۔میں پھیلتے پھیلتے اتنا پھیل گیا کہ شناخت نے اپنے معنی بدل ڈالے۔ میں شہر کی سب سے اونچی عمارت کے سب سے اونچے طبقے کے اندر جھانکنے لگا۔ میرا بچہ مجھے دیکھ کر اپنی ماں سے چیخ چیخ کر کہنے لگا۔۔۔۔۔

"ممی۔۔۔۔۔ممی۔۔۔۔۔ڈیڈی بھوت بن گئے۔"

یہ پہچان پر پہلی کاری ضرب تھی۔ لیکن یہ احساس بہرحال اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت اختیار کرنے لگا کہ میں اپنے تصور سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔ قد کے اونچے ہونے پر سنبھل سنبھل کر چلنے کی بصارت مجھ سے چھین لی گئی۔۔۔۔کب اور کیسے فہم کی لوہے جیسی دیوار ٹوٹ گئی اس کے بارے میں ایک ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ہوا۔ میرے پاؤں کے نیچے آئی ہوئی بھکارن چیخی تو ضرور ہوگی۔ لیکن اتنے اونچے قد پر سماعت کیسے ہوگی۔ یہ تو دوسری بات ہے کہ جب بھونچال آتا ہے تو کتنی ہی قد آور چوٹیاں اپنے سر خم کر دیتی ہیں۔ وہ بھی ایک بھونچال تھا۔ جس نے میری چھین لی گئی سماعت مجھے واپس کی۔

"کمینہ!۔۔۔۔پاجی!!۔۔۔۔۔ذلیل!!!"

وہ میرے بھاگتے ہوئے قدموں کے ساتھ اپنے قدم ملاتی رہی۔ بھکارن کا نحیف مریل جسم جنون کا مرکزی کردار بنا۔ یہ کہاں کی بہادری تھی کہ اژدہام کے سامنے میں سینہ تان

کر کھڑا ہوتا۔ تاریخ نے ایسے کرداروں کے ساتھ کیسا سلوک کیا، کیا وہ ڈھکی چھپی بات ہے؟

کتنے ہی کٹے ہوئے جسموں کو سونے کے تمغے عطا کیے گئے۔ لیکن وہ تو حالات نے لا فانی بنائے یا شوق نے۔ اس لیے میں نے ایک وسیع سرسبز میدان میں اپنے لیے ایک پناہ گاہ بنائی۔ لیکن میدان میں دروازہ کیسا۔۔۔۔۔؟

پھر بھی میں نے دروازہ بند کیا اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگا۔ جلاد کی تیغ جب چلتی ہے تو کس کو معلوم ہے کہ کہاں جا کر لگے گی۔ میدان تو میدان ہے۔ کب تک میں محفوظ رہ سکتا تھا۔ وہ تھوکتے رہے، اور میں اپنے آپ کو بچاتا رہا۔ پھر جب وہ تھک گئے اور میری معصومیت پر مر مٹنے کے لیے راضی ہو گئے تو میں سمجھا کہ میرا سب کچھ دھل گیا۔

میں اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا۔ جیسے شیر کچھار سے۔ لیکن معصومیت میں جادوگری کی روح حلول ہو گئی۔ شعبدہ بازی اب تو میرے لیے گھر کی لونڈی بن کر رہ گئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ میری ہر حرکت کو کسی کی تباہی یا فلاح پر تعبیر کرنے لگی۔ اور اب جب میں مہاتما سمجھا گیا تو ہمارے لیے خانقاہوں کی بنیادیں ڈالی جانے لگیں۔

کچھ بھرم تو رکھنا ہی ہوگا۔ میں مریدوں کو کب تک مایوس کرنے والا تھا۔ میرا قد جو پہلے ہی اونچا تھا اور اونچا ہوتا گیا۔ یہ اب میرے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے پرستاروں کو اپنے زریں اقوال سے آشنا کروں۔ ان میں سے بہت سے اقوال بہت ہی پرانے تھے، لیکن ہر پرانی چیز کا نشہ دوآتشہ ہوتا ہے۔ میں نے ان سے کہا:

''آپ اپنے آپ کو پرکھنا چاہتے ہو تو اپنے ہی جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرو۔ بیٹھے بٹھائے بہروپ سے نجات کون چاہتا ہے۔

نقصان پر فائدہ ہمیشہ بھاری لگتا ہے۔ پھر نہ جانے کہاں سے انا آئی۔ پہلے مجھے گلے لگایا۔ میری تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے۔ پھر جاتے جاتے ناگ اپنے گلے سے اتار کے میری گردن میں پہنا دیا۔ میں نے لاکھ چاہا کہ اس سے کہوں، کیوں بھئی؟ اس بوجھ سے میری گردن تھک جائے گی۔۔۔۔۔

لیکن۔۔۔۔ میری زبان نے میرا ساتھ نہ دیا۔ اس ناگ نے مجھے اپنی گرفت میں اس سختی سے لیا جیسے کسی نے مجھے ارغوانی شراب میں نہلا دیا ہو۔ بے ہوشی کی اس کیفیت سے

فرار کا صرف ایک راستہ تھا کہ ناگ سے چھٹکارا حاصل کروں۔لیکن ناگ مجھ سے زیادہ ہوشیار تھا۔میں راستوں کا انتخاب کرتا رہا اور وہ اپنے اوپر میرا خون ملتا رہا۔

پھر نہ جانے مجھ میں جہد کا جذبہ کیسے اور کیوں کر آندھی کی تیزی اختیار کر گیا کہ میں نے ناگ سے اپنی گردن آزاد کرانے کے لیے اپنے فولادی ہاتھوں میں اس کا جسم لیا۔لیکن اس نے اپنے جسم کی مضبوطی سے کام لیتے ہوئے میری گردن دبوچنی شروع کی۔ مجھے اپنی سانس رکتے ہوئے محسوس ہونے لگی۔ میرے ہاتھوں سے طاقت چھین لی گئی۔ میں ہار گیا لیکن میرا ہاتھ کھل گیا۔۔۔۔۔یا۔۔۔۔۔

میری مٹھی کھل گئی۔۔۔۔۔اب تو اڑان تھی،اڑان کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔خلا میں اڑنے والے آسمان کو اپنی سمت بناتے ہیں۔آج مجھے معلوم ہوا کہ آئینہ بھی جھوٹا ہے۔آئینہ کب کسی کو پہچان پایا کہ اب مجھے پہچان پاتا۔

ابھی وحدت کا لفظ ملا۔۔۔۔۔ورنہ آئینہ کب کا ٹوٹ گیا ہوتا۔

☆☆☆

تجزیہ:

ڈاکٹر جاوید انور (وارانسی)

''مٹھی،اڑان،آسمان'' جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اس افسانے کا دار و مدار ابہامی عناصر پر ہے۔یہ وحشی سعید کا کمال ہے کہ موضوع کے اعتبار سے علامتی پیرایۂ اظہار پورے افسانے میں موجود ہے۔عنوان پر ہی غور کیا جائے تو ''مٹھی'' بمعنی بند یعنی قید کی علامت ہے جس کے اندر جو کچھ بھی ہے، آزادی سے محروم ہے۔یہ مٹھی ہوس پرستی کی ہو،مفاد پرستی کی ہو یا پھر دوسروں کے دکھ درد کا احساس نہ ہونے کی ہو،اس میں قید انسان ہر حال میں اخلاقی،اقداری اور سچائی کی اڑان سے محروم رہتا ہے اور اس طرح وہ اس وحدت کی محبت تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکتا جو ساری کائنات کا مالک ہے اور جس کے سراغ میں اخلاق،اقدار،سچائی اور انسانیت کے جذبات کے آسمان میں پرواز ضروری ہے۔

اس افسانے کا کردار ''میں'' ایک ایسے شخص کی علامت ہے جو انسانیت اور اخلاقیات سے دور صرف اپنے مفاد کے لئے زندگی بسر کرتا محسوس ہوتا ہے۔رشوت خوری یا دوسرے طریقے کے غلط دھندوں سے کمائی دولت کے ذریعہ وہ سب سے اونچے بمعنی امیر ترین طبقے میں شمار تو ہونے لگتا ہے لیکن جس طرح انسانیت جسم کو روشن کرنے کے ساتھ ساتھ روحانی مسرتوں کا بھی پیش خیمہ ہوتی ہے،اسی طرح ناجائز کاموں ،ظلم ،اپنے ذاتی مفاد کے لئے دوسروں کی حق تلفی اور اس سبب ان کے دل سے نکلتی ہوئی آہیں بھی اپنے اثرات جسم اور روح پر ظاہر کرتی ہیں، جب بظاہر چہرے سے رونق ختم ہونے اور ایک قسم کی نحوست ٹپکنے کا احساس ، بدن کا بیڈول پھیلاؤ اور روحانی اضطراب ، یہ تمام مل کر ایک ایسی فضا قائم کرتے ہیں جو خود انسان کے شناخت نامے سے تبدیل ہو کر کسی حیوان ،درندے کا شناخت نامہ محسوس ہوتی ہے۔

''مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ مجھ پر یہ حقیقت کب آشکار ہوگئی۔کہ میری شبیہ آئینے میں نظر نہیں آرہی ہے۔ایسے اوقات زندگی کا حوصلہ توڑنے والے تو ضرور ہونے چاہئیں،لیکن ہماری گرفت کب اور کہاں تک رہ سکتی ہے ہم پر؟۔۔۔۔۔۔میں پھیلتے پھیلتے اتنا پھیل گیا کہ شناخت نے اپنے معنی بدل ڈالے۔میں شہر کی سب سے اونچی عمارت کے سب سے اونچے طبقے کے اندر جھانکنے لگا۔میرا بچہ مجھے دیکھ کر اپنی ماں سے چیخ چیخ کر کہنے لگا۔۔۔۔۔

''ممی۔۔۔۔۔ممی۔۔۔۔۔ڈیڈی بھوت بن گئے۔''

بچے کا یہ کہنا کہ ''ممی۔۔۔ممی۔۔۔۔ڈیڈی بھوت بن گئے''اپنوں کے اندر سے اس ظلم اور ناانصافی کے خلاف پہلا احتجاج ہے جو یہ بھی باور کراتا ہے کہ باہر کے لوگوں پر کس قدر اپنی طاقت بھر ظلم توڑے گئے،ان کی حق تلفی کی گئی ،بے انصافی کی گئی کہ ان کی آہیں اور فریادیں گھر کے اندر ایک چھوٹے بچے کی زبان بن گئیں۔جن پر غور کرنا اب ضروری ہو گیا تھا۔یہ مسلم حقیقت ہے کہ آدمی اچھا برا جیسا بھی عمل کرتا ہے،اس کی شناخت ویسے ہی بنتی چلی جاتی ہے خواہ اس کو کوئی بتائے یا نہ بتائے۔لیکن ایک انتہا کے بعد جب اسے اس کا احساس ہوتا ہے تو اس راستے پر اتنا آگے نکل چکا ہوتا ہے کہ واپسی بھی خود کی ذات سے جہاد کے مترادف ہوتی ہے۔پاؤں کے نیچے آئی ہوئی بھکارن کسی مظلوم کی علامت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے ۔اس کے الفاظ''کمینہ۔۔۔پاجی۔۔۔۔ذلیل!!!'' ایسے کرب آمیز فریاد یہ الفاظ کی شکل

اختیار کر لیتے ہیں جو تقریباً تمام مظلومین اور شریف النفس افراد کی آہ وفریاد اور لعنت ملامت کو ایک اژدہام میں بدل کر اس کے پیچھے لگا دیتے ہیں۔

یہ الفاظ جو اس کی ذہن اور دل میں اندر تک سرایت کر کے جب اس کی وقت اور حالات کے ہاتھوں چھینی ہوئی اس کی ساعت بمعنی انسانیت کو واپس لے آتے ہیں تو وہ اپنے لئے صداقت کی جائے پناہ جو سرسبز اور شاداب وسیع میدان کی طرح ہے، کا انتخاب محفوظ ہونے کے لئے کرتا ہے۔لوگوں کا اس کے اوپر تھوکنا یہاں ان پریشانیوں اور اذیتوں کا استعارہ بن جاتا ہے جو اس راہ میں لازمی ہے۔لیکن ان سب کو برداشت کرتے ہوئے حالات سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے جب وہ صداقت کی منزل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو مہاتما سمجھا جانے لگتا ہے۔

اس کی اس تبدیلی کو تقلید کے طور پر اپنانے کی خواہش رکھنے والے اس سے صداقت کی منزل کی راہ دریافت کرنا چاہتے ہیں تو وہ کہتا ہے۔

''آپ اپنے آپ کو پرکھنا چاہتے ہو تو اپنے ہی جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرو۔بیٹھے بٹھائے بہروپ سے نجات کون چاہتا ہے۔''

ظاہر ہے کہ جن اذیتوں سے ''وہ'' اپنے ضمیر اور روح کی اضطرابی کی مجبوری سے دو چار ہوا تھا اور انہیں سر کیا تھا، عیاری مکاری کے ساتھ آرام سے زندگی بسر کرنے والے صرف جذباتی سطح پر کوری تقلید کی خواہش میں ایسی قربانیاں کہاں دینے والے تھے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اذیتوں اور تکلیفوں کو برداشت کر لینے سے آگے بھی دشوار مراحل ہیں۔

''نقصان پر فائدہ ہمیشہ بھاری لگتا ہے۔پھر نہ جانے کہاں سے انا آئی۔پہلے مجھے گلے لگایا۔میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے۔پھر جاتے جاتے ناگ اپنے گلے سے اتار کر میری گردن میں پہنا دیا۔''

صداقت کی ایک منزل تک رسائی کے بعد جبکہ دنیاوی مکر وفریب کے نقصان کے سامنے قلبی وروحانی تسکین فائدے مند محسوس ہوتی ہے، زندگی کے چلتے رہنے میں ایک منزل یا پہلی منزل پر بھی رکا نہیں جا سکتا۔منزلیں راستوں کی صورت اختیار کر کے نئی منزلوں اور انہیں سر کرنے کے نئے اصولوں کا پتہ بھی دیتی ہیں، جن میں ایک دشوار تر اصول ''انا'' نامی ہے جو

کب فطرت میں شامل ہو جاتا ہے،اس کا احساس نہیں ہوتا۔احساس تب ہوتا ہے جب یہ اصول شخصیت کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

''وہ'' کی زندگی میں ایسے کئی مراحل آئے جب اس نے ''انا'' کے اصول سے چھٹکارا پانا چاہا لیکن اس کے ''ناگ'' جواب تک کی صداقت کی منزل پر قائم رہنے کا ثمرہ تھا، وہ ان مراحل سے زیادہ طاقتور ہوتا گیا اور انہیں سر کرتا گیا۔آخر کار اس نے اپنے ارتقائی نہج میں ''وہ'' کی ''مٹھی'' کھول دی۔اب وہ وحدت کے ان نظاروں کی سیر کر رہا تھا جو آسمان کی طرح لامحدود تھے۔اس طرح وحدت کے لفظ نے آئینے سے ابھرتے ہوئے اس کے عکس کو بھی تبدیل کر دیا تھا جو کہ پہلے اس کا شناخت نامہ تھا۔

آسمانی صحائف یا انسانیت کے فلسفے کے نقطۂ نظر سے وحشی سعید نے آج کی عیش پرست زندگی کے لئے ایمان اور ضمیر کا سودا کرنے والے،ظلم اور ناانصافی میں غرق حاضر راوی جو مرکزی کردار ہے، کی اس اعلیٰ مقام تک رسائی حاصل کرنے کی مشکلات اور جدوجہد کو اپنے افسانے کا موضوع بنا کر جس لفظی ترتیب سے پیش کیا ہے، وہ اسے لازوال بنا دیتا ہے۔

☆☆☆

Tilafi by Noor Shah (Srinagar) cell-9906771363

نورشاہ (سرینگر)

تلافی

جھیل کی اُبھرتی ڈوبتی لہروں سے ٹکرا کر جب وہ اپنے تیراکی کے لباس میں سوئمنگ ناؤ پر لوٹ آئی تو ناؤ پر موجود دس بارہ لوگ اس کی جانب لذت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ اتنے سارے لوگوں کو اپنی جانب دیکھتے ہوئے وہ صرف مسکرا دی، بالکل ویسے ہی جیسے کوئی مرغابی کبھی کبھار اپنی نازک سی گردن کو ایک جھٹکا دے کر اپنے پر پھڑ پھڑاتی ہے۔ ویسے بھی اس کی آنکھوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے جھیل کے چہرے پر دو کھلے ہوئے کنول ہوں اور چہرے کی رنگت بھی بادام کے شگوفوں جیسی تھی۔ میں سوئمنگ ناؤ کے ایک گوشے میں تیراکی کے لباس میں اپنی سوچوں میں گم تھا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ مجھے تیرنا نہیں آتا۔ واٹر ٹیوب کے سہارے کئی بار پانی میں اترنے کی کوشش ضرور کی تھی۔ اپنے من کی شانتی کے لیے، اپنی سوچوں کی شگفتگی کے لیے، لیکن میرے جسم کی بناوٹ شاید مجھے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ میرے جسم میں ٹیڑھے پن کے زاویے میری جسمانی بناوٹ کی بدصورتی کی عکاسی کرتے تھے۔ سوچتے سوچتے میرا دل بھر آیا۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ بھلا فرقان کے اصرار پر میں یہاں آیا ہی کیوں........؟ نہانا ہی تھا تو روز کی طرح اپنے گھر کے اُس بند غسل خانے میں نہاتا جہاں پر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ اُس غسل خانے میں، میں نے اپنے آپ کو گھور گھور کر دیکھتا تھا۔ ہر زاویے کو پہچانتا تھا اسی غسل خانے میں اپنے آپ کو دیکھ کر مجھے اپنی بس صورتی کا احساس ہوا تھا اور اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی تھی۔ میں ڈریسنگ روم کی جانب جانے لگا۔ تیراکی کے لباس میں اپنے جسمانی زاویوں کی نمائش کرنے سے بہتر تھا کہ کپڑے پہن کر اپنی بدصورتی کو دوسروں سے چھپالوں، اس اجنبی لڑکی سے بھی جواب بھی مسکرا رہی تھی۔

''مسٹر........!''........ کانسی کے کٹورے سے آواز آرہی تھی۔ وہ بھورے بالوں والی اجنبی لڑکی میرے قریب آرہی تھی۔

''آپ نہائے، بغیر ہی واپس جا رہے ہیں........؟''اس نے پوچھا۔
''بس جا رہا ہوں''۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ میں گھبرا سا گیا۔
''مگر کیوں........؟''
''مجھے تیرنا نہیں آتا۔''میری آنکھیں پتھرا سی گئیں۔
''اگر آپ کو تیرنا نہیں آتا تو پھر یہ سوئمنگ ڈریس کیوں........؟''
میں خاموش رہا، خاموشی شاید انسانی بے بسی کی علامت ہوتی ہے۔
''میں آپ کو تیرنا سکھاؤں گی۔''
کہتے ہوئے وہ ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی میں جیسے صبح کا اجالا پن تھا۔ اس کے ہونٹوں کی حرکت سے جیسے شفق کا زرّیں سونا پگھل رہا تھا۔
''مگر........!''میں نے کچھ کہنا چاہا۔ میرے ہونٹ کسی بوسیدہ قلعے کے دروازے کی طرح بند تھے۔ درجنوں آنکھیں ہمیں گھور رہی تھیں۔ فرقان نے قریب آ کر کہا:''آج تک ڈوبتے آئے ہو۔ آج کسی کے سہارے تیر کر بھی دیکھ لو۔''
دفعتاً میری سوچوں میں ایک ان دیکھی قوت ابھرنے لگی...... ''اگر ایک حسین سی، ایک نازک سی لڑکی مجھ میں دلچسپی لے سکتی ہے تو میں اپنے آپ سے نفرت کیوں کروں........؟ آخر میں بھی تو ایک انسان ہی ہوں۔ میری چاہتیں بھی تو تشنہ ہیں۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ پیار کے نام پر کسی کی حسین سوچیں میری ملکیت ہوں۔ روح کے حسن کے لیے پیار کی کیف آور سوچیں لازمی ہیں۔ میں بدصورت ہی سہی مگر میری سوچیں بھی کہیں ٹھہری ہوئی ہیں۔ کسی انجانے اجنبی مدوجزر کی پنہائیوں میں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ ایک دن لپک کر میرا ہاتھ تھام لیں گی۔ شاید یہی میری منزل ہو........ اب تو منزل میرے قریب ہے، بالکل قریب۔ محبت خوبصورت لوگوں کی جاگیر نہیں اور پھر اگر میری قسمت میں ایک بھورے بالوں والی لڑکی سے ملاپ طے ہے تو اس میں میرا کیا دوش........''
میں نے فرقان کی طرف دیکھا۔ وہ دور سے اب بھی مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے دبی آواز میں کہا........
''کچھ بھی ہو، آج مجھے تیرنا ہوگا۔''میں نے اپنا سر اونچا کیا اور لڑکی کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے

میرے گلے میں ٹیوب لٹکا دیا اور مسکراتے ہوئے مجھے پانی میں دھکیل دیا۔
مجھے لگا جیسے پانی میں میرا دم گھٹ رہا ہو اور میں جھیل کی گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ پانی میرے سر کے اوپر ہونے لگا اور پھر میں خود بخود پانی کی سطح پر ابھر آیا۔ میں نے ٹیوب کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے تالی بجا رہی تھی۔ میں تیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''ایسے نہیں........ '' وہ بولی۔
''مجھ سے نہیں ہوتا۔''
''ٹھہرو........ '' یہ کہہ کر اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔
ٹیوب کے سہارے میں پانی میں بالکل کھڑا ہو گیا۔ اسکا ہاتھ میری کمر کو چھونے لگا۔ اس نے مجھے پانی میں لیٹا دیا اور مجھے تیرنا سکھانے لگی۔
جب وہ ٹانگیں ہلانے کو کہتی تو میرے ہاتھ چل پڑتے۔ جب ہاتھوں کو حرکت میں لانے کی ضرورت محسوس ہوتی تو خود بخود میری ٹانگیں چلنے لگتیں۔ بے ساختہ اس نے میری کمر پر ایک ہاتھ رکھا۔ کاش میں عمر بھر تیرنا نہیں سیکھتا اور ایسے ہی نرم و نازک ہاتھوں کا سہارا ملتا۔ کتنا پیار تھا اس کے انداز میں۔ کتنی قربت تھی اس کے سکھانے میں۔ میں بے خبری میں ہاتھ پاؤں چلاتا رہا۔
مجھے زندگی کا سب سے انوکھا پیار مل رہا تھا۔ عورت کا پیار........ محبوبہ کا پیار........ انوکھا........ پر کیف اور خواب آور۔ اب میری راتیں بے خواب نہیں گزریں گی۔ کاش زندگی میں ایسا ہی سب کچھ ہو جاتا اور دنیا اس خوبصورت جھیل میں سمٹ جاتی۔
''ہاں، ہاں........ اب ٹھیک ہے۔ بالکل ایسے ہی۔'' اس نے کہا۔
پھر ہم ناؤ پر چلے آئے۔ وہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔ باتوں باتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ اسکا نام مالا ہے۔ اسے تیرنے کا بہت شوق ہے اور یہی شوق اسے خشک ریگستانوں سے پہاڑوں اور پانی کی وادی میں لے آیا تھا۔ دفعتاً اس نے مجھ سے کہا'' ذرا سنو، وہ لڑکی اپنے ساتھی سے کیا کہہ رہی ہے........ '' اس نے سامنے بیٹھے ہوئے ایک جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔
''وہ........ ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ وہ اپنی بیوی کو نہانے کے لے کہہ رہا ہے مگر وہ شرما رہی ہے۔''

''عجیب سی بات ہے۔آخراس میں شرمانا کیوں........!''

''اتنے لوگ جو ہیں یہاں۔''میں نے کہا۔

''مگر وہ حسن ہی کیا جو دوسروں سے چھپایا جائے۔ ارے یہاں کے مرد ہیں کہ اپنے جسم کی نمائش کرتے ہیں اورعورتیں ہیں کہ کپڑوں میں لپٹی ہوئیں۔''

''یہ تو اپنی اپنی تہذیب ہے۔عورتوں کی اپنی دنیا ہے۔اپنی تہذیب ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہرخوبصورت چیز کی نمائش ہونی چاہیئے''۔اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

''گویا عورتیں نہ ہوں، نمائش میں سجاتی ہوئی دکانیں ہوں، شکارے میں رکھے ہوئے رنگ برنگے پھول ہوں۔''

''یو........ناٹی بوائے........ان کی بات کرر ہے ہو یا میری........!''وہ مسکرادی........

ایک بار پھر وہی پہلے چاند کی مسکراہٹ۔

''آپ یہاں اکیلی آئی ہیں........؟''

''نہیں، میرے ڈیڈی میرے ساتھ آئے ہیں۔''

''آپ کی شادی ہوچکی ہے........؟''میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

وہ کچھ سوچنے لگی۔اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے مجھے پانی میں دھکیل دیا۔ میں پانی میں جھولتا رہا۔ دوسرے لوگ واٹرسکیٹنگ کا مزہ لے رہے تھے او رمیری طرف حیرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

نہ جانے کیسے ایک موٹر لانچ میرے سامنے سے گزری۔ میں ڈگمگایا۔ پانی کی لہروں نے مجھے اونچا اچھال دیا۔ میں نے چیخنا چاہا مگر جیسے میری آواز بے آواز ہوگئی۔ اچانک مجھے اپنی بدصورتی یاد آگئی اوراحساس کمتری کا شکار بن کر رہ گیا۔ میں نے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی مگر بےمقصد۔ واٹر ٹیوب میرے ہاتھ سے نکل کر دور کہیں پانی کی سطح پر تیرتا چلا گیا۔

''میں آرہی ہوں۔''

اور پھر ایک نرم و نازک ہاتھ مجھے سنبھالنے لگا۔ یہ ہاتھ کسی اور کا نہیں بلکہ مالا کا تھا۔ اسکا ہاتھ کانپ رہا تھا۔گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ بے خیالی کے عالم میں، میں پھسلا اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے مالا سے لپٹ گیا۔آہستہ آہستہ ہم ناؤ کی طرف آنے لگے۔

وہ مسکرا رہی تھی۔ اسکے گداز جسم میں تھرتھراہٹ سی تھی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے مالا میری جنم جنم کی ساتھی ہو۔ میں پھر اپنے جسم کے بدصورت زاویوں کو بھول گیا۔ آج مجھے جھیل بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ سب کچھ خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ ہم ناؤ پر چلے آئے۔ میں نے اپنے بدصورت جسم کو تولیے سے ڈھانپتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ........''

''کس بات کا........!''

''آپ نے ڈوبنے والے کو تیرنا سکھایا''۔

وہ خاموش رہی۔ میری بدصورتی میں شاید کسی کا نقش ڈھونڈ رہی تھی۔ پھر ایک آبی پرندے کی طرح اپنا جسم سکیڑا اور دوبارہ جھیل میں چھلانگ لگانے کی تیاری کرنے لگی۔

''وہ بھی تیرنا نہیں جانتا تھا۔ میں نے اسے تیرنا سکھایا اور پھر ایک دن ایسی ہی ایک جھیل میں ڈوبنے دیا۔ وہ ڈوب گیا۔ جھیل کی تہہ میں سو گیا........ لیکن تم........ نہ جانے کیوں میں نے تمہیں ڈوبنے سے بچا لیا........ نہ جانے کیوں........!''

مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔

''تم نے اسے ڈوبنے دیا لیکن کیوں........؟''

''کیونکہ وہ بدصورت تھا''۔........ اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''میں بھی تو بدصورت ہوں۔ مجھے کیوں بچا لیا؟''

وہ خاموشی سے میری جانب دیکھتی رہی۔ لگاتار دیکھتی رہی۔ جانے کیا تلاش کر رہی تھی؟ کس کو تلاش کر رہی تھی؟ میری آنکھوں میں، میرے وجود میں، میرے جسم کی بدصورتی میں........!

اور پھر خاموشی سے جھیل میں کود گئی۔ دائیں بائیں کسی کو ڈھونڈتی رہی۔ اب اس میں دلچسپی لینے والا کوئی نہ تھا۔ لذت بھری نظروں سے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ سب جھیل کی ڈوبتی ابھرتی لہروں کو دیکھتے رہے اور وہ تن تنہا دور تک بہتی رہی، بہتی چلی گئی۔ شاید اس بدصورت انسان کی تلاش کرتی رہی جو ایک ایسی ہی کسی جھیل کی تہہ میں چھپا مجھے دوسری زندگی دے چکا تھا........!!

☆☆☆

Seeta ka Banbaas by Najma Usman (Surrey, UK) cell-0044-7936911711
نجمہ عثمان (سرے۔یو۔کے)

سیتا کا بن باس

''آخری فیصلہ آپ کو ہی کرنا ہے۔'' شازیہ کہہ رہی تھی۔ ''میں آپ کو اکیلا چھوڑ کر اتنی دور ہرگز نہیں جاؤں گی۔''

رابعہ جو اس کی بات سن کر کھوسی گئی تھی گھبرا کر بولی۔

''اکیلا کہاں؟ تمہارے ڈیڈ بھی تو ہیں۔''

''اوہ! مما یو نو واٹ آئی مین وہ ٹھیک ہوتے تو۔۔۔''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر رابعہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں سمجھتی ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو لیکن اب تم اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو ہماری فکر چھوڑ و۔۔۔اور سلمان کیا کہتا ہے؟''

''انہوں نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے۔وہ بھی آپ دونوں کے لئے پریشان ہیں۔''

رابعہ غور سے بیٹی کی طرف دیکھ رہی تھی۔کتنی سمجھدار ہوگئی ہے اور تئیس برس کی عمر میں کتنی ذمہ داری کا احساس ہے اسے۔۔۔

''بولیں نا مما۔۔۔'' شازیہ نے لاڈ سے اس کا کندھا ہلایا۔

''بس اب تم جاؤ رات کے دس بج رہے ہیں سلمان بھی انتظار کر رہا ہوگا مجھے سوچنے کا موقع دو۔ویک اینڈ تک آنا سلمان کو لے کر۔پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔'' وہ کہتے کہتے کھڑی ہوگئی۔''اور ہاں گھر پہنچ کر مجھے فون کر دینا۔''

شازیہ کے کار اسٹارٹ کرنے تک وہ اپنی دوسری منزل کے فلیٹ کی کھڑکی سے اسے دیکھتی رہی ۔اب دس بجے رات کو یہ کار دوڑاتی برکسٹن (Brixton) سے ویمبلے (Wembley) تک جائے گی اور میرا دل اسی میں پڑا رہے گا۔کتنی نڈر ہے جیسے عموماً یہاں کے پلے بڑھے بچے

ہوتے ہیں۔وہ کھڑکی کے پردے برابر کر کے مڑی۔سامنے دیوار کے ساتھ کارنر ٹیبل پر شازیہ اورسلمان کی بڑی سی شادی کی تصویر مسکرارہی تھی۔ پراعتماد چہرے۔۔۔اندرونی خوشی کے غماز چہرے۔وہ ٹیلی فون کے پاس والے صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔تو فیصلے کی کنجی پھر اس کے ہاتھ میں تھمادی گئی تھی۔

پہلے فیصلے کی کنجی اٹھائیس برس پہلے اسے سونپی گئی تھی۔اور وہ۔۔۔آنکھوں میں خواب سجانے والی لڑکی جو ابھی ابھی ایم اے کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی ۔۔۔راتوں کو دیر تک پڑھنے کی جگار ابھی آنکھوں میں بھری ہوئی تھی۔امتحان ہال تک آنے جانے کی تھکن ابھی کہاں اتری تھی۔لمبی نیندیں لینے اور سارا دن دنیا بھر کے فضول کاموں کا پروگرام ابھی ذہن میں ترتیب بھی نہ دینے پائی تھی کہ لندن سے ڈاکٹر حامد کا رشتہ ہوا کے دوش پر اڑتا چلا آیا۔

خاندان بھر کی رائے تھی کہ اس سے بہتر جوڑ رابعہ کے لئے نہیں ملے گا۔ایم اے پاس لڑکی کے لئے کم از کم پی ایچ ڈی تو ہو اور وہ بھی لندن میں مقیم۔شاید اسی رشتے کے توسط سے باقی چھوٹی بہنوں کی قسمت بھی کھل جائے۔امی ابو راضی نہیں تھے اور سمجھانے والے اپنی سی کوشش کئے جاتے تھے۔بڑی خالہ جن کی اپنی دو بیٹیاں اچھے رشتوں کے انتظار میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو چلی تھیں امی کو سمجھا رہی تھیں۔

''اے بہن! یہ رشتہ ہاتھ سے نکل گیا تو سر پکڑ کر رہ جاؤ گی۔سوچو تو تمہارے لئے آسانی ہی آسانی ہے چار کپڑوں میں لڑکی رخصت ہو کر لندن چلی جائے گی۔ پاکستان میں شادی اور رخصتی ہوتی تو اخراجات چوگنے ہوتے اور پھر کون سے تمہارے بیٹے ہیں جو ہاتھ بٹاتے۔بس خدا رکھے میاں کا دم ہے اور کل کس نے دیکھا ہے۔میری مانو تو بس بسم اللہ کرو۔''

ابو کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں بڑھتی رہیں۔۔ان کی لاڈلی رابعہ کتنے ارمانوں سے لکھایا پڑھایا گیا اسی دن کے لئے کہ سب کو چھوڑ کر اتنی دور چلی جائے۔۔۔رابعہ سب دیکھتی رہی۔گھر میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔سرگوشیوں میں باتیں ہوتیں۔اسے دیکھ کر سب چپ ہو جاتے۔اس کی منہ زور طبیعت سے سب واقف تھے۔بڑی خالہ شہہ دیتیں ''اے لڑکی سے پوچھ کر تو دیکھو۔'' لیکن بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔

ادھر رابعہ کے ننھے، منے دل میں اپنے والدین اور بہنوں کے لئے جو نرم نرم احساس

دھڑک رہا تھا اس نے بی مانو کو خود ہی گھنٹی باندھنے کے لئے لا کھڑا کیا۔ ابو کی خاموش نگاہوں کا پیغام وہ پڑھ چکی تھی۔ امی کے چہرے پر التجا کے نظر نہ آنے والے آنسو اس کے وجود کا ایک ایک انگ بھگو رہے تھے۔ ایک ہی آواز تھی۔ راستہ دے دو آگے بڑھ جاؤ۔۔۔ یہ لو فیصلے کی کنجی اور بہنوں کے مستقبل پر لگے ہوئے قفل کھول دو۔۔۔ خود اس کا اپنا مستقبل کیا تھا اسے سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔

ڈاکٹر حامد لندن میں سائیکالوجی کے پروفیسر تھے۔ بڑی خالہ کے دیور جو ایک عرصے سے لندن میں مقیم تھے ان کے توسط سے یہ رشتہ آیا تھا۔۔۔ اور پھر۔۔ ٹیلی فون پر نکاح ہو گیا اور دسمبر کی ایک ٹھنڈی اور کہر آلود شام کو۔۔۔ سرخ بنارسی ساڑھی میں لپٹی جب وہ ہیتھرو ائیر پورٹ پر اتری تو اس کے قیمتی اثاثے میں ماں باپ کی دعائیں، بازوؤں پر امام ضامن اور ہینڈ بیگ میں حامد کی تصویر اور نام پتے کی تفصیل تھی۔

حامد کو پہچاننے میں اسے تھوڑی دقت ہوئی۔ تصویر کے مقابلے میں وہ اسے کہیں زیادہ دبلا اور کمزور دکھائی دیا۔ اور وہ بھی اکیلا نہ دوست احباب اور نہ کوئی رشتہ دار یا جاننے والی خاتون۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈری ڈری سہمی سہمی اس کے ساتھ ائیر پورٹ سے باہر نکلی تو لندن شہر کی برفیلی ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ ٹیکسی میں گھر تک کا راستہ خاموشی میں ہی کٹا۔ حامد نے سفر کے بارے میں دو چار سوال کئے اور بس۔۔۔

حامد کے فلیٹ میں فرنیچر کم اور کتابیں زیادہ تھیں۔ وہ سمجھ رہی تھی شاید اس نے اپنے گھر پر جاننے والوں کو بلایا ہو گا لیکن یہاں بھی اسے مایوسی ہوئی۔ بڑی خالہ کے دیور جو رشتہ کرانے میں آگے آگے تھے وہ بھی نظر نہیں آئے۔ اور جب حامد نے بڑی نرمی سے اس کہا کہ اگر وہ چاہے تو ہاتھ منہ دھو کر کپڑے تبدیل کر لے تو حیرانی اور غم وغصہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جنہیں چھپانے کے لئے وہ تیزی سے باتھ روم میں گھس گئی۔ اندر لگے ہوئے آئینے میں اس نے اپنے اوپر نظر ڈالی بہنوں نے کس محبت سے اس کے بالوں کا خوبصورت جوڑا بنایا تھا۔ چودہ گھنٹے کی فلائیٹ میں وہ اس جوڑے کو سنبھالتی رہی کہ کہیں خراب نہ ہو جائے ہاتھوں کی مہندی کچھ زیادہ ہی لال ہو گئی تھی۔ گھر کی بوا نے اس کے ہاتھوں میں تیل لگا کر سوکھی مہندی چھڑاتے ہوئے کہا تھا۔ ''اے ذرا دیکھنا! بی بی کے ہاتھوں پر کیا تیز رنگ چڑھا ہے۔ نصیبوں

والی ہے میری شہزادی۔۔دولہا پلکوں پر بٹھا کرر کھے گا۔' وہ اپنے ہاتھوں کی سرخ سرخ مہندی کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔نہ جانے میرے نصیب میں کیا لکھا ہے وہ سوچ رہی تھی۔لندن آنے سے پہلے روز رات کو اس کے جسم پر ابٹن ملا جاتا تھا۔لڑکیاں ڈھولک پر سہاگ گیت گاتیں۔شادی کی خوشی یک طرفہ ہی تھی۔بس اماں بہنوں نے اپنی خوشی پوری کر لی تھی۔حامد کے سب رشتہ دار ہندوستان میں تھے۔

اس روز رابعہ نے اپنی سرخ بنارسی ساڑی اتار کے کیا رکھی جیسے اپنے کنوار پنے کے سارے خواب بھی اس میں لپیٹ کرر کھ دئے۔۔۔اور پھر اسے پتہ چلا۔۔۔حامد بیمار تھا شدید نفسیاتی بیمار۔۔۔وہ تین مہینے سے ایک نفسیاتی ہسپتال میں زیر علاج تھا۔کالج سے سک لیو (sick leave) پر تھا۔پچھلے تین سالوں میں یہ تیسرا کالج تھا جہاں اس نے پڑھانا شروع کیا تھا وہ تھوڑے عرصے ایک جگہ پڑھاتا پھر وہاں کے اسٹاف سے اس کی ان بن ہو جاتی۔وہ چاہتا تھا کہ ہر کوئی اسے پروفیسر کا درجہ دے، ڈاکٹر حامد کہے۔پھر اسے ڈپریشن کے دورے پڑنے لگتے اور مجبوراً ڈاکٹر اسے گھر پر آرام کا مشورہ دیتے۔اور یوں بھی ہوتا کہ حامد کسی بہت ہی معمولی بات پر ناراض ہو کر کالج والوں کو اپنا استعفیٰ بھیج دیتا۔

یہ باتیں کچھ حامد نے اور کچھ سامنے کے فلیٹ پر رہنے والی بیوہ مسز سمتھ نے بتائیں۔مسز اسمتھ کو رابعہ سے گہری ہمدردی تھی۔بیچاری لڑکی لاعلمی میں کس بیمار کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔رابعہ کی ڈائری میں بڑی خالہ کے دیور کا پتہ اور ٹیلی فون نمبر تھا۔اس نے ان سے رابطہ کیا وہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ بھیانک مذاق اس کے ساتھ کیوں کیا گیا۔وہ لاعلم نکلے۔۔۔۔انتہائی شرمندہ تھے کہ اتنے عرصے سے حامد کو جاننے کے باوجود وہ اس کی نفسیاتی بیماری کے بارے میں نہ جان سکے۔پچھلے کچھ مہینوں سے حامد نے یوں بھی ان سے قطع تعلق سا کر لیا تھا۔کسی سیاسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ ان سے الجھ گیا اور بات اتنی بڑھی کہ اب وہ ان کی صورت تک دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔

رابعہ نے یہ سب کچھ تحمل سے سنا اور شریف گھرانے کی سمجھدار اور پڑھی لکھی لڑکیوں کی طرح اپنے نوشتہ تقدیر کو قبول کر لیا۔اس نے گھر والوں کو پاکستان میں کچھ نہیں بتایا۔کیا فائدہ امی ابو کا دل دکھانے سے۔پھر اس کے کسی بھی غلط قسم کے قدم اٹھانے کا اثر اس کی بہنوں کے

مستقبل کو تاریک کر سکتا تھا۔

حامد کو کالج میں پھر سے پڑھانے کے چانس ملنے کا امکان بہت کم تھا۔ جہاں بھی درخواست بھیجتا اسے کسی نہ کسی بہانے سے رد کر دیا جاتا۔ رابعہ نے ہاتھ پاؤں مارے ایم اے انگلش تھی اچھی خاصی انگریزی بول لیتی تھی۔ لندن کے ایک (chain) چین فوڈ اسٹور کے اسٹاک ڈیپارٹمنٹ میں کام مل گیا۔ اس نے بڑی محنت سے کام سیکھا اور ایک سال کے اندر ہی اسی سیکشن کی جونیئر منیجر بن گئی۔ فوڈ اسٹاک کی ساری سپلائی کا ریکارڈ رکھنا اس کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ حامد کا گزارہ مستقل سوشل بینیفٹ (social benefit) پر تھا۔ وہ اب بھی لندن کے کالجوں میں لمبی لمبی درخواستیں بھیجتا اور زیادہ تر سائیکالوجی کی بڑی بڑی کتابوں میں غرق رہتا۔ مہینہ دو مہینہ میں اسے ڈپریشن کے شدید دورے پڑتے اور دوروں کے نتیجے میں رابعہ تختۂ مشق ستم بنتی۔ حامد دوروں میں بالکل وحشی بن جاتا اور اذیت پرستی پر اتر آتا۔ مسلسل بار بار جسمانی اور جذباتی طور پر ٹوٹ پھوٹ کر نڈھال ہو کر رابعہ ڈاکٹر کو بلاتی۔ ڈاکٹر آتا اور اینٹی ڈپریشن گولیوں کی تعداد بڑھا دیتا۔ ان کے زیر اثر حامد زیادہ تر سونے میں وقت گزارتا۔ اس کی لمبی لمبی سونے جاگنے کی کیفیت کے بیچ، رابعہ کی ازدواجی زندگی میں چھوٹے سے چھوٹے جذبے بھی سہم سہم کر بیدار ہوئے اور کسی ان جانے خوف کے تحت ڈر ڈر کر اپنی موت آپ مر گئے۔ کتنی ہی راتیں ایسی گزریں جب وہ خود سخت تکلیف اور جان کنی کی حالت میں تھی اور بیدار تھی۔ جب کہ حامد نیند کی گولیاں کھا کر غفلت کی نیند سو رہا تھا۔ لندن میں اس سال سخت برفباری ہوئی۔ وہ اپنے فلیٹ کے سامنے والے فٹ پاتھ ہی پر پھسل کر گر پڑی۔ دو ہفتے پلاسٹر میں جکڑی ٹانگ لئے کراہتی رہی۔ شادی کے بعد چار سالوں کے دوران دو دفعہ اس کا اسقاط حمل ہوا۔۔۔ ذبیحہ خانے سے بھاگے ہوئے ادھ کٹے بکرے کی طرح اپنے ہی خون میں نہا کر وہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لوٹ پوٹ کر وہ خود ہی ٹھیک ہو گئی۔

شادی کے پانچویں سال شازیہ اس دنیا میں آ گئی۔ اس رات بھی حامد سو رہا تھا۔ رابعہ نے اسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ گولیوں کے زیر اثر سوئے مریض اگر اٹھا دیئے جائیں تو خطرناک ہوتا ہے۔ اس نے خود ہی ایمبولینس کے لئے فون کر دیا۔ حامد کے لئے نوٹ لکھ کر اور مسز اسمتھ کو بتا کر وہ ہسپتال چلی گئی۔ حامد دوسرے روز مسز اسمتھ کے ساتھ ہسپتال دیکھنے آیا۔

بچی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں پہلے تو خوش ہوا پھر رونے لگا۔ رابعہ حیران حیران اسے دیکھتی رہی پہلے تو وہ کبھی اتنا جذباتی نہ ہوا تھا۔

''دیکھو رابعہ۔۔۔'' وہ سنبھل کر بولا۔ ''یہ بالکل تمہاری طرح ہے ہم اس کا نام شازیہ رکھیں گے۔۔۔اچھا نام ہے نا!''

اس کے جانے کے بعد رابعہ تکیہ میں منہ دے کر خوب روئی۔ نہ حامد نے پوچھا اور نہ ہی رابعہ بتا سکی کہ اس بچے کی پیدائش کے بعد ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ رابعہ کے لئے دوبارہ ماں بننا خطرناک تھا۔ اپنے لئے بھی اور بچے کے لئے بھی۔ حامد کو جس تعداد میں مختلف دوائیں دی جاتی تھیں بہت ممکن تھا کہ ہونے والے بچے کی نشونما میں کسی قسم کا نقص پیدا ہو جاتا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ شازیہ میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں تھا۔ لیکن آئندہ کے لئے ڈاکٹر یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔

رابعہ کی نوکری پکی ہو چکی تھی اس لئے اسے تین مہینے کی میٹرنٹی (maternity) کی چھٹی مل گئی۔ یہ بھی اس کی خوش قسمتی تھی کہ نیچے والے فلیٹ میں سنگل مدر جین اسکاٹ رہتی تھی۔ اس کا اپنا بچہ چھ مہینے کا تھا۔ اس نے شازیہ کو رکھنے کی ذمہ داری لے لی اور یوں رابعہ چھ ہفتے کی شازیہ کو اس کے پاس چھوڑ کر پھر سے کام پر چلی گئی۔

شازیہ نے آنکھ کھول کر باپ کو اسی حالت میں دیکھا۔ جب وہ ذرا سمجھ دار ہوئی تو نہ جانے کیسے خود بخود یہ بات سمجھ گئی کہ میرا باپ اور باپوں سے مختلف ہے۔ اس نے حامد سے کبھی کسی چیز کی نہ فرمائش کی اور نہ دوسرے بچوں کی طرح ضد کی۔ البتہ ہر کورس یا نئی کلاس شروع کرنے پر وہ حامد کو تفصیل سے سب کچھ بتاتی۔ اس کا موڈ اچھا ہوتا تو سن لیتا کبھی ایک آدھ مشورہ بھی دے دیتا اور نہ یہ کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلا جاتا کہ جو کچھ بھی کر رہی ہو اپنی مما سے پوچھ کر کرنا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی کی تیز آواز سن کر وہ اپنے خیالات کی دنیا سے لوٹ آئی ادھر سے شازیہ بول رہی تھی۔ ''مما میں خیریت سے پہنچ گئی ہوں۔ اب آپ آرام سے سو جائیں اور ہاں جلدی فیصلہ کر لیں تاکہ پیکنگ وغیرہ کر سکیں۔''

''کیسی پیکنگ؟'' رابعہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

''یونومما۔ میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''اچھا۔۔۔اچھا۔۔۔اب خدا حافظ، اتوار کو بات کریں گے۔'' رابعہ نے جلدی سے فون بند کر دیا۔

حامد حسب معمول گہری نیند سو رہا تھا۔ پچھلے ہفتے اسے پھر ڈپریشن کا دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے گولیوں کی تعداد بڑھا دی تھی اس کے سوا ان کے پاس کوئی دوسرا حل بھی تو نہ تھا۔ نیشنل ہیلتھ کے تحت چلنے والے زیادہ تر نفسیاتی ہسپتال بند کر دیئے گئے تھے۔ ورنہ ممکن تھا حامد کو کسی ایسے ہسپتال میں داخل کر دیا جاتا۔ اب حامد جیسے کئی مریض یا تو اپنے گھر والوں کے رحم و کرم پر تھے اور جن کا دنیا میں کوئی نہیں تھا وہ اکیلے ہی ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے تھے۔

رابعہ بستر میں سونے کے لئے لیٹی تو نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کیا کرے۔۔۔ فیصلہ۔۔۔ پھر وہی صبر آزما لمحے۔۔۔ کرب و اذیت۔۔۔ راستہ دے دو۔۔۔ ہٹ جاؤ۔۔۔ اٹھائیس برس پہلے کا فیصلہ تو شاید بوڑھے والدین کی مجبوری اور چھوٹی بہنوں کے مستقبل کی مصلحت میں لپٹا ہوا تھا۔ مجبوری جو اسے سات سمندر پار لئے آئی۔ اپنوں سے جدا کر دیا۔ اس کے خواب۔ کنوار پنے کے خواب، اب بھی اس سرخ بنارسی ساڑی کی تہوں میں لپٹے رکھے تھے۔ وہ اس ساڑی کی تہیں کھولتے ڈرتی تھی۔ اس نے سوچا تھا شازیہ کی شادی پر یہ ساڑی اسے دے گی۔ لیکن نہ جانے کیوں وہم اور وسوسوں نے اسے گھیر لیا۔ اس نے ساڑی کو جوں کا توں پرانے سوٹ کیس میں رکھ کر لاک کر دیا۔

وہ کروٹیں بدل رہی اور ماضی کی تصویریں ذہن کے پردے پر چلتی رہیں۔ شازیہ نے اے لیول کا امتحان دیا تھا۔ وہ ان دنوں آنرز کی ڈگری کے لئے مختلف یونی ورسٹیوں میں اپلائی کر رہی تھی۔ جو کمپیوٹنگ کورس وہ کرنا چاہتی تھی وہ لندن کے علاوہ برمنگھم اور لیوٹن یونیورسٹی میں بھی مل رہا تھا۔

''مما دعا کریں مجھے لندن میں ہی داخلہ مل جائے'' شازیہ کہہ رہی تھی۔

''اور میں چاہوں گی تم لندن سے باہر رہ کر آنرز کرو۔'' رابعہ کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

شازیہ حیران تھی ''مگر کیوں مما؟ آپ ڈیڈ کو اکیلی کیسے سنبھالیں گی میں ہرگز گھر سے دور نہیں جاؤں گی۔۔۔نو وے۔''

''کیوں نہیں جاؤ گی ۔کل کلاں تمہاری شادی ہوجائے گی جب بھی تمہیں گھر چھوڑ نا ہوگا۔''

''اوہ! مما۔ یوتھنک ٹو فار''

سوچنا پڑتا ہے ہم ساری زندگی تمہیں ساتھ نہیں رکھ سکتے ۔ پھر بیٹیاں تو ویسے بھی مہمان ہوتی ہیں ۔'' رابعہ اور سنجیدہ ہوگئی تھی ۔شازیہ اس کو ٹالنے کے لئے اور موضوع بدلنے کے لئے بولی ''جسٹ لائیک یو۔۔۔آپ بھی تو سب کو چھوڑ کر چلی آئیں ۔''

''ہاں میری جان ۔'' رابعہ آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں میں ہنس کر بولی ۔۔۔

''جسٹ لائیک می ۔''

شازیہ کو واقعی لندن سے باہر لیوٹن یونیورسٹی جانا پڑا۔ تین سال کا لمبا عرصہ، رابعہ نے کس مشکل سے کاٹا اسے اپنی بیٹی پر ہر طرح سے اعتماد تھا۔شازیہ کی شخصیت میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔وہ حد سے زیادہ نڈر اور سمجھ دار تھی ۔ اپنی ماں کے حالات کو دیکھتے ہوئے بھی اس کے اندر مردوں کے لئے کسی قسم کا غصہ یا نفرت نہ پل سکتی تھی ۔حامد اسے جس قدر بے بس اور بے ضرر نظر آتا رابعہ اتنی ہی بہادر اور مظلوم ۔رابعہ نے شازیہ کو لیوٹن بھیج دیا اور خود اس کا اپنا سکون وقرار بھی اس کے ساتھ رخصت کر دیا۔اٹھارہ سال کی جوان جہاں لڑکی کو یونیورسٹی کے ماحول میں بھیجنے کا مطلب وہ اچھی طرح جانتی تھی ۔ان کے جاننے والے مسلمان گھرانوں نے سنا تو انگلیاں دانتوں میں داب لیں۔

لڑکی کو اتنی دور اکیلا بھیج دیا۔ یونیورسٹی کا ماحول ویسے بھی آزاد ہوتا ہے ۔شراب ۔ ڈرگز ۔توبہ ۔توبہ ۔ اتنے گندے ماحول میں ایک شریف مسلمان لڑکی کس طرح رہ سکتی ہے ۔توبہ ۔توبہ۔رابعہ کا فیصلہ چٹان کی طرح اٹل تھا۔''میری لڑکی ہے کسی کو کوئی اختیار نہیں ۔ کہنے والے کو ذہنیت ہی گندی ہے ۔سوچنے والے جو چاہیں سوچیں ۔ جو جی چاہے کہیں ۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں ۔''

اس کی زندگی میں ایک کمزور لمحہ ضرور آیا تھا جب شازیہ ایک سنجیدہ اور بردبار قسم کے انگریز کو لئے ہوئے گھر میں داخل ہوئی ''مما یہ مائیکل ہے ہماری کمپیوٹنگ فرم کا مینیجر ۔'' رابعہ نے پکی عمر کے اس غیر ملکی کو غور سے دیکھا۔وہ شازیہ سے کم از کم دس بارہ سال بڑا ہوگا لیکن اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی نرمی اور باتوں میں اتنی ملاحت تھی کہ رابعہ اس سے ایک گھنٹے

ہی کی ملاقات سے بے حد متاثر ہوئی۔ مائیکل حامد سے ملنے کا مشتاق تھا لیکن وہ اس وقت سو رہا تھا۔شازیہ نے خوش ہو کر بتایا کہ مائیکل نے اسلام کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔کئی سال سے کر رہا ہے۔آج کل قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ بھی پڑھ رہا ہے۔یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔رابعہ کے سینے پر سے جیسے وزنی بوجھ سا ہٹ گیا۔پھر وہ بھی سوچ رہی تھی کہ ڈگری لینے کے بعد شازیہ کو اس کمپیوٹنگ فرم میں کام کرتے دو سال گزر گئے تھے۔آج تک اس نے کبھی مائیکل کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔اس نے شازیہ کو اپنی زندگی کا ساتھی چننے کے سلسلے میں پوری آزادی دے رکھی تھی،صرف اچھے برے کا فرق سمجھا دیا تھا۔اور کیا کرتی۔وہ جانتی تھی کہ ملنے جلنے والے پاکستانی گھرانوں میں حامد کی بیماری اور بیکاری اور شازیہ کی بے جا آزادی،ہمیشہ ایک چٹ پٹے موضوع کی حیثیت رکھتی تھی اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ شازیہ کوئی ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائے جو اسے برسوں ''پرانی رابعہ'' کا روپ دے دے۔

مائیکل کے جانے کے بعد رابعہ چپ چاپ سی تھی۔شازیہ اس کا بغور جائزہ لے رہی تھی پھر آہستہ سے بولی۔''جو آپ سمجھ رہی ہیں مما۔۔۔ایسا نہیں ہے۔میں مائیکل کو دو سال سے جانتی ضرور ہوں وہ بہت نیک اور شریف انسان ہے۔ہم اچھے دوست ہیں اور بس۔۔''

''اور اب۔۔۔؟'' رابعہ نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔

''اب مائیکل باقاعدہ دائرہ اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے۔اور اس نے مجھے پروپوز بھی کیا ہے۔آپ یقین کریں مما۔اس سے پہلے شادی وغیرہ کا سوال ہی نہیں اٹھا۔۔۔''

رابعہ خاموشی سے سنتی رہی اور شازیہ بولتی رہی۔''وہ میری بہت عزت کرتا ہے۔میرے والدین کی عزت کرتا ہے۔میں نے اپنے گھر کے سب حالات اسے بتا دیئے ہیں۔وہ پھر بھی ڈیڈ سے ملنا چاہتا ہے۔آج زبردستی میرے ساتھ آ گیا ہے۔اس سے ملتے ہوئے باتیں کرتے ہوئے مجھے کبھی گھبراہٹ (uneasy feeling) نہیں ہوتی۔وہ ایک اچھا انسان ہے مما۔۔'' بولتے بولتے شازیہ کی آواز بھرا گئی اور رابعہ نے تڑپ کر اسے گلے لگا لیا۔

مائیکل برابر ملنے آتا رہا۔حامد سے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتا۔سر کھپاتا،وہ سو رہا ہوتا تو رابعہ سے گپ شپ کرتا اس کے ہاتھ کے پکائے ہوئے تیز مصالحے والے کھانے سی سی کر کے اور خوش ہو ہو کر کھاتا۔حامد کے لئے وہ انسان کے روپ میں ایک فرشتہ تھا جو زمین پر اتر کے چلا

آیا تھا۔ایک طویل عرصے سے رابعہ اور بیٹی کے علاوہ وہ کسی تیسرے انسان کے قرب سے بھی نا آشنا تھا۔ ملنے جلنے والے اس کی لغت میں وہ لوگ تھے جو اس کی بے مصرف اور سسکتی زندگی رینگتی زندگی پر صرف تبصرے اور تنقید کر سکتے تھے اور فضول قسم کے مشوروں سے نواز سکتے تھے ۔مائیکل نے اس کی دکھتی رگ پر کبھی ہاتھ نہیں رکھا۔نہ ناصح بن کر سمجھایا اور نہ اس کے حال پر افسوس کیا۔وہ حامد کے موڈ کے مطابق گفتگو کرتا اور بس۔

مائیکل مسلمان ہو گیا اور حامد کا پسندیدہ نام ''سلمان'' رکھا گیا۔پھر لوگوں نے دیکھا کہ رابعہ نے اس دھوم دھام سے شازیہ کی شادی رچائی کہ لوگ پاکستان میں ہونے والی شادی کی تقریبات کو بھول گئے۔ مایوں،ابٹن،مہندی کی رسم سے لے کر اس نے چوتھی تک کرڈالی۔دل کے سارے ارمان نکال لئے۔سلمان کے والدین اور دو بہنوں نے مانچسٹر سے آکر شرکت کی ۔گو کہ وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر انہوں نے شادی کی ہر رسم میں خوشی خوشی اور بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔مہندی والے دن شازیہ کی سہیلیاں اس کے پیچھے لگ گئیں۔

''آیئے آنٹی آپ کو بھی مہندی لگادیں۔''رابعہ نے اپنی ہتھیلیوں کو غور سے دیکھا ۔برسوں پہلے لگی ہوئی مہندی اور اس میں سے جھلکتے ہوئے ادھورے ارمانوں اور خوابوں کا خون جیسے پھر سے رس رس کر ٹپکنے لگا۔''نہیں بیٹی میں مہندی نہیں لگاتی،سردی کا اثر ہو جاتا ہے ۔''حامد نے صرف نکاح میں شرکت کی اس کے علاوہ گھر میں کیا ہورہا ہے وہ تقریباً بے نیاز رہا۔

سلمان کا فلیٹ ویمبلے (Wembley) میں تھا۔مختصر دو بیڈروم کا فلیٹ شازیہ اور سلمان نے مل کر اپنی پسند سے سجایا تھا۔وہ دونوں ویک اینڈ پر رابعہ اور حامد کے پاس ضرور چکر لگاتے گھر کی بھاری شاپنگ خاص طور پر گوشت،چاول،آٹا وغیرہ کی ذمہ داری اب سلمان نے لے لی تھی۔اس دن وہ دونوں آئے تو رابعہ کے کچن کا نل ٹپکے جارہا تھا اور رابعہ کسی پلمبر کو فون کرنے کی فکر میں تھی۔سلمان فوراً نیا واشر (washer) لے آیا اور منٹوں میں نل ٹھیک کر دیا۔وہ تھا ہی .D.I.Y میں ماہر۔دیکھتے دیکھتے رابعہ کا پورا کچن تقریباً نیا لگنے لگا۔پرانے کچن میں یونٹ بدلے،دیواروں پر پینٹ کیا اور نیا لائنو (lino) لا کر ڈالا۔رابعہ کے دل سے اس کے لئے ڈھیروں دعائیں نکلتی تھیں وقت پر سب کام ہو جاتے تھے بغیر بتائے،بغیر احسانوں کا پلندہ لادے ہوئے۔رابعہ سوچتی یہ فرق ہے ہم میں اور انگریز قوم میں۔سلمان کی سوچ کتنی

پریکٹیکل(practical) ہے اس کے کام کرنے کا انداز ہم سے کتنا مختلف ہے پھر وہ سوچتی ہم ایشیائی لوگ، اس ملک کی ،اس ملک میں بسنے والے انگریزوں کی اچھی باتیں کیوں نہیں اپناتے۔ حامد جیسے نفسیاتی مریض کا اس ملک میں گزارہ ہو گیا۔ سوشل بینیفٹ کے سہارے نیشنل ہیلتھ کے بل بوتے پر۔ ہم پھر بھی یہاں کی گورنمنٹ سے گلہ کرتے ہیں۔ اپنے حقوق منوانے کے لئے نت نئے مطالبات لے کر جاتے ہیں۔ اور نہ ملنے پر ہائے واویلا کرتے ہیں۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد شازیہ نے انہیں خوش خبری سنائی۔ حامد تو سن کر خوشی کے مارے رونے لگا۔ ''میں نانا بن جاؤں گا۔۔۔'' پھر وہ جذباتی ہو گیا۔ ''میں اپنے نواسہ، نواسی سے خوب کھیلوں گا۔ انہیں سکول سے لایا کروں گا، پارک لے جاؤں گا۔''

شازیہ کی آنکھیں اپنے بچپن کی ننھی منی ادھوری خواہشوں سے لبریز ہو کر چھلک پڑیں ۔اس کے بچپن کی یادوں میں ایک معصوم خواہش اب بھی نمایاں تھی۔ کاش میرے ڈیڈ مجھے اسکول چھوڑنے اور لینے آتے۔ وہ حسرت سے دوسرے بچوں کو اپنے اپنے باپ کے ساتھ جاتا دیکھتی۔ پھر بڑی سمجھداری سے بہت ہی چھوٹی عمر میں اس نے یہ خواہش اندر ہی اندر دبا لی تھی۔ حامد پہلے بھی مجبور تھا اور اب تو اور بھی بیمار، کمزور ہو گیا تھا۔ لیکن خواہشیں دبانے کے باوجود جوان رہتی ہیں۔۔ تروتازہ وشاداب رہتی ہیں۔۔۔ شازیہ روتی رہی اور رابعہ کے وجود کے اندر دور بہت دور کسی لہو کی صورت میں آنسو ٹپکتے رہے۔ لیکن اس نے بڑی مضبوط آواز میں باپ بیٹی کو اس جذباتی سین سے نکالنے کی کوشش کی۔ کبھی کبھی ایک چھوٹی سی خوشی اپنے ساتھ بڑی خوشیاں لے کر آتی ہے۔ ادھر شازیہ ماں بننے والی تھی اُدھر سلمان کی فرم نے امریکہ میں برانچ کھولنے کا فیصلہ کیا اور اسے وہاں پر وموشن پر بھیجنے کی آفر دی۔ آخری فیصلے کی کنجی شازیہ اس کے ہاتھ میں دے کر چلی گئی تھی اور رابعہ کروٹیں بدلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ وہ کیا کرے۔ حامد کی بیماری روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ آج کل وہ بڑی تعداد میں اینٹی ڈپریشن گولیاں کھا رہا تھا ۔بعض دفعہ جاگتی حالت میں بھی اس کی گفتگو بالکل بے ربط ہوتی۔ ہفتوں کپڑے نہیں بدلتا اور نہ نہاتا۔ پردے گرائے بند کمرے میں لحاف اوڑھے سوتا رہتا۔ پسینے میں بھیگے ہوئے کپڑوں سے بو آنے لگتی۔ پھر رابعہ بک جھک کر نہانے پر آمادہ کرتی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ میں نے اب تک حالات کا اکیلے مقابلہ کیا۔ پہلے شاید اپنے سروائیول

(survival) کے لئے شازیہ کی خاطر اور اب صرف اور صرف حامد کے لئے۔ میں اس حالت میں اسے لے کر کس طرح امریکہ چلی جاؤں۔ یہاں جیسا بھی ہے اپنا فلیٹ ہے۔ اپنی چھت کے نیچے بیٹھے ہیں۔ جو چاہے کرو، اب میں وہاں پر جا کر اپنے داماد کے یہاں پڑ جاؤں۔ چلو یہ فلیٹ بیچ کر وہاں پر اپنا ٹھکانہ بھی کر لیا پھر بھی نیا شہر ہوگا اور ہم رہیں گے تو بیٹی داماد کے رحم و کرم پر۔ اس عمر میں مجھے نوکری کون دے گا۔ پھر امریکہ میں نیشنل ہیلتھ سسٹم بھی نہیں ہے۔ پرائیویٹ علاج کراؤ۔ اتنا پیسہ کس کے پاس ہے۔ شازیہ سلمان کے پاس ابھی ہمارے لئے وقت ہے۔ بچے ہوں گے مصروفیات بڑھیں گی اور ساتھ میں ہم دونوں کی عمر اور بوجھ بھی۔

اور یہ جو میں نے اتنا لمبا بن باس لیا وہ یونہی رائیگاں جائے گا۔ اب تو آس تھی ایک مبہم امید تھی شاید بن باس ختم ہونے والا ہو۔ ادھر پاکستان سات سمندر پار ادھر امریکہ دوسرے پر۔ اسے یاد تھا ایک دفعہ جب شازیہ چھوٹی تھی وہ اسے لے کر پاکستان گئی اور دو ہفتے میں ہی گھبرا کر واپس آ گئی۔ اتنے مشورے اور ہمدردیاں تھیں اور ان کی آڑ میں چھپے ہوئے تیر و نشتر کہ وہ پریشان ہو گئی۔ شادی کے بعد لندن آنے کے فیصلے کی کنجی کے گرد اس کے والدین کی مجبوری اور چھوٹی بہنوں کا مستقبل لپٹا ہوا تھا۔ اب تو کوئی مجبوری نہیں تھی۔ یہی تو بات تھی کہ کوئی مجبوری نہیں تھی۔ پھر کیا تھا؟ زندگی کا بہترین حصہ۔۔۔ اپنی ساری جوانی۔ اس نے حالات کی قید میں گزار دی۔۔۔ اب جب کہ یہ مدت ختم ہونے والی تھی کہ کھلنے والے دروازے کے سامنے ایک اور دیوار کھڑی کر دی گئی۔ فرق یہ تھا کہ یہ دیوار اس نے خود چنی تھی۔ قید کی معیاد تو بڑھنی ہی تھی۔ کوئی مجبوری نہیں تھی۔ یہ تو وہ خود اپنے آپ کو پابند کر رہی تھی۔ یہ دشوار گزار راستے اب کتنے جانے پہچانے لگتے تھے۔۔۔ یہ گلیاں کتنی مانوس مانوس سی تھیں جن میں سے وہ اپنا دکھی اور آسودہ جسم لئے گزرتی رہی۔ اس قفس کے کونے کونے سے اس کی صبح و شام اتنی مانوس ہو چکی تھیں کہ اب کسی نئے قفس میں رہنا ممکن نہیں تھا۔۔۔ اس سوچا مجھے اس قفس سے لگاؤ سا ہو گیا ہے اور آس پاس کچھ شناسا اور ہمدرد چہرے بھی موجود ہیں، دوسرا بن باس تو مجھے گزارنا ہی ہے اور اس میں کسی اور فیصلے کی گنجائش ہی کب ہے۔؟

☆☆☆

Afsanche افسانچے

Khwahish, Mujrim, Wuzoo, Khwab, Shaque, Wrong Side, Extra, Dard by

Dr. Nazir Mushtaq (MBBS,MD) cell-9149984865

ڈاکٹر نذیر مشتاق (ایم بی بی ایس، ایم ڈی) سرینگر۔

خواہش

دیویندرداس کٹھاریا عرف دیوداس اپنے گھر کی کھڑکی کے نزدیک کرسی پر بیٹھا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا............ باغیچہ میں اس کی انتہائی خوبصورت انگریز بہو لولینا ایک دورنگی کتے کے ساتھ کھیل رہی تھی.......وہ بال پھینکتی تو کتا جھٹ سے دوڑ کر لے آتا.......لولینا اسے چومتی چاٹتی اسے گلے لگاتی۔۔۔۔۔کتا کبھی اوپر کبھی نیچے.......وہ کتے کے ساتھ وقت گزارتی.......دیوداس دس برسوں سے تنہائی کے دیو کے ساتھ لڑ رہا تھا.......وہ اس وقت غور سے اپنی بہو اور کتے کا رومانی کھیل دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں کچھ سوچ رہا تھا۔

اچانک وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔۔۔۔۔اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے باغیچہ میں آیا.......چند لمحے بہو اور کتے کا کھیل دیکھ کر وہ بہو کے نزدیک آیا اور گلا کھنکھارتے ہوئے بہو سے مخاطب ہوا............''لولینا میرے ساتھ بھی اسی طرح کھیلا کرو''............

''توم کیا کوتا ہے............لولینا نے کتے کو چومتے ہوئے کہا''

اچانک دیوداس کے دل میں ایک آوارہ خیال کلبلایا:

''کاش میں کتا ہی ہوتا''............

☆☆☆

مجرم

. حوالدار جبار ڈار انسپکٹر کے نزدیک گیا اور پیار سے پوچھا.... ''کیا بات ہے سر... اپ کچھ پریشان سے لگتے ہیں''......انسپکٹر نے سگریٹ کا زوردار کش لگایا اور کہا.... ''ارے بھائی وہ جو چھ ماہ پہلے ارب پتی جوالا سنگھ کی دکان سے کروڑوں کی مالیت کے ہیرے جواہرات چوری ہوئے تھے اور ایک محافظ بھی مارا گیا تھا، وہ کیس مجھے سونپ دیا گیا تھا مگر آج تک کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ مجرم کا پتہ نہیں چل سکا، اوپر سے زبردست پریشر ہے۔ سی ایم تک بات پہنچ گئی ہے.... شاید مجھے سسپینڈ کیا جائے گا.... میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کروں.... وہ مجرم''........ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ سنتری ملایم سنگھ نے سلیوٹ بجا کر کہا.... سر یہ جنٹلمین آپ سے ملنا چاہتا ہے......اجنبی نے انسپکٹر کی طرف دیکھ کر کہا.. ''سر آپ کو یہ جان کر بہت خوشی ہوگی کہ جس مجرم کی آپ کو تلاش ہے اسے میں اچھی طرح جانتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے.... '' انسپکٹر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، اس نے اجنبی سے پوچھا.... ''کون ہے وہ۔ کہاں ہے وہ''.... اجنبی نے تفصیل سے سب کچھ بتایا اور پھر انسپکٹر کے سامنے دست راست دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''سر میرا انعام''.... انسپکٹر نے حوالدار جبار ڈار کو حکم دیا..... ''اس آدمی کو فوری ہتھکڑی پہنا دو۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آج تک خاموش رہا۔ اسے حوالات میں بند کرو اصلی مجرم یہی ہے''...

☆☆☆

وضو

ملا صابر علیم کے سامنے ایک بیحد خوبصورت لڑکی کھڑی تھی اور وہ اسے دیوانہ وار چوم رہا تھا۔ وہ لڑکی ملا صاحب کی ہمسائیگی میں رہتی تھی اور اس کے لئے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا لائی تھی.... اتفاق سے ملا کی بیوی کسی کام سے باہر گئی تھی.... ملا نے لڑکی سے گوشت کا ٹکڑا لے کر اسے گلے لگایا۔ لڑکی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ ملا کے حوصلے بلند ہوئے.... وہ لڑکی کو بیڈ روم کی طرف لے جانے لگا کہ اچانک نچلی منزل سے اس کی بیوی کی آواز بلند ہوئی.... ''اجی سنتے

ہو میں آ گئی''..... ملا نے بوکھلا کر لڑکی سے کہا.... ''لو یہ۔ گوشت نیچے میری بیوی کو دے دو۔ اور ہاں اس سے کچھ نہیں کہنا''.... لڑکی چلی گئی، ملا پسینے میں شرابور دوسرے کمرے میں چلا گیا جہاں دس ننھے منے بچے اس کا انتظار کررہے تھے۔ وہ ان کو پارہ عم پڑھاتا تھا....

وہ ہانپتا ہوا بچوں کے سامنے بیٹھا اور بچوں سے کہا.... ''ہاں تو نکالو آج کا سبق.. ''سورہ فیل''........ اچانک اس کے نتھنوں سے عجیب قسم کی بد بو ٹکرائی.... اس نے بچوں کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا... ''کس نے؟.... '' بولو کس نے؟.... مجھے معلوم ہے.... یہ کس کے جسم کی بد بو ہے.... خود کھڑا ہو جائے۔ ورنہ''.... ایک معصوم بچہ تھر تھراتے ہوئے کھڑا ہوا.... ''ملا صاحب میں نے....... ملا نے اسے گھورتے ہوئے کہا.... کمبخت... بے وقوف.. نامراد.... وضو ٹوٹ گیا ہے اور پارہ عم۔ کو ہاتھ لگا رہا ہے.... جا بے شرم جلدی سے وضو بنا کے آجا........

☆☆☆

خواب

''کیا بکتی ہے تو''.... حسینہ کی ماں نے سامنے کھڑی بیٹی سے کہا.... ''پاگل ہو گئی ہو کیا؟.... ایک ماہ پہلے تمہارے کہنے پر ہم نے تمہاری منگنی توڑ دی۔ اب تم دوبارہ رشتہ جوڑنا چاہتی ہو۔ یہ ناممکن ہے''.... ''ماں اس دنیا میں کچھ بھی ممکن ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ارشد علی ہمارا رشتہ قبول کرے گا.... '''' مگر تم کیوں ٹوٹا ہوا آئینہ جوڑنا چاہتی ہو۔ تم نے تو کہا تھا وہ لڑکا تجھے عیش و آرام کی زندگی نہیں دے سکتا ہے۔ اب اچانک تم نے اپنا خیال کیسے بدلا''۔ ''میں نے خواب دیکھا کہ وہ اس ریاست کا بہت مشہور آدمی بن چکا ہے۔ اس کے پاس ایک بہت بڑی حویلی ہے۔ وہاں نوکر چاکر ہیں۔ آنگن میں دو تین قیمتی گاڑیاں ہیں... لوگ اسے جھک جھک کر سلام کرتے ہیں. تمہیں تو معلوم ہے میرا خواب ہمیشہ سچ ہوتا ہے''۔

''ماں پلیز میری شادی اسی ارشد علی سے کرادو''.... حسینہ نے ایک ہی سانس میں کہہ دیا...

''پاگل لڑکی''.. ماں نے اسے ہلکی سی چپت رسید کی اور مسکراتے ہوئے کہا.. ''اچھا جو تو چاہے گی وہی ہوگا......''

رات کے بارہ بجے حسینہ نے تکیے کے نیچے سے اخبار نکالا اور اخبار میں چھپے ارشد علی کے فوٹو کو بے تحاشا چومنے لگی اور پھر فوٹو کے نیچے چھپی سرخی کو پڑھنے لگی........

ارشد علی خان سول سروسز امتحان میں پورے ملک میں اول آیا ہے...

☆☆☆

شک

چالیس سال کی عمر میں بیوہ ہونے کے بعد سرلا دیوی اپنی بھانجی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگی....اس کی بھانجی رادھیکا ایک مقامی اسپتال میں نرس کے فرائض انجام دیتی تھی۔وہ صبح سے شام تک ڈیوٹی پر رہتی اور اوور ٹائم بھی کرتی....اس کی ایک معصوم بچی تھی جو ذہنی طور پر معذور تھی....رادھیکا کو اس وجہ سے سسرال والوں نے کچرے کی طرح باہر پھینکا تھا کہ اس نے ذہنی طور پر معذور لڑکی کو جنم دیا تھا....رادھیکا نے بیٹی کی کونسلنگ کے لیے ایک ماہر کونسلر کا انتخاب کیا تھا جو ہفتے میں پانچ دن گھر ہی میں بچی کی کونسلنگ کرتا۔اس دوران سرلا دیوی بچی اور کونسلر کا خیال رکھتی۔کونسلر بچی اور سرلا دیوی سے مانوس ہو چکا تھا........

اُس روز ٹی وی پر سیریل کے دوران سرلا دیوی ایک ایڈ دیکھ کر حیران ہوگئی...اور کچھ سوچنے لگی......شام کو جب رادھیکا اسپتال سے واپس لوٹی تو باتوں باتوں میں سرلا دیوی نے اس سے ایڈز بیماری کے متعلق پوچھا.......راھیکا نے تفصیل سے اسے ایچ آئی وی ایڈس کے متعلق ہر بات سمجھائی........سرلا دیوی غور سے سنتی رہی...

دوسرے دن رادھیکا کو ایک مریض کے ساتھ ایچ آئی وی ایڈس ٹیسٹنگ سینٹر جانا پڑا....وہاں اس نے سرلا دیوی کو اپنی بچی کے ساتھ قطار میں کھڑا دیکھا........

☆☆☆

رانگ سائڈ Wrong side

محمد علی سمنانی اپنی قیمتی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا۔ڈرائیور نے پچھلا دروازہ بند کیا اور پھر گاڑی اسٹارٹ کی... محمد علی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا........اف کتنا ٹریفک....ہر جگہ رک رک کر چلنا پڑتا ہے...ہر کوئی اپنی من مانی کرتا ہے....اکثر لوگ رانگ سائڈ ڈرائیو کرتے ہیں اور اکثر لوگ مقررہ رفتار سے گاڑی تیز چلاتے ہیں.... کسی کو قانون کا پاس نہیں ہے....ٹریفک کی ایسی صورت حال دنیا میں کسی اور جگہ نہیں ہوگی....وہ۔وہ۔رانگ سائڈ جارہے ہیں....Idiots۔

نہ جانے کب سدھریں گے یہ لوگ....... اچانک اسے ایک جھٹکا لگا.......

''کیا ہوا''........ اس نے ڈرائیور سے پوچھا.... ''سر ایک موٹر بائیک والا رانگ سائڈ سے آرہا تھا.. بال بال بچ گیا........''Idiot....''

وہ زیر لب بڑبڑایا.... کچھ دور چل کر.... گاڑی رک گئی.... ''اب کیا ہوا''.... **محمد علی** نے قدرے جھنجھلاتے ہوئے کہا.... ....

''سر.... ٹریفک جام ہے.... لگتا ہے بہت دیر لگے گی....''

''سر اگر آپ کہیں تو میں رانگ سائڈ ڈرائیو کروں.... اس ٹریفک جام سے چھٹکارا ملے گا''.... ڈرائیور نے کہا.... ٹھیک ہے چلو تم بھی رانگ سائڈ ڈرائیو کرو.. جو سب کرتے ہیں ہم بھی وہی کریں گے...... ڈرائیور گاڑی کو دائیں طرف موڑنے والا ہی تھا کہ اچانک **محمد علی** کو کچھ یاد آیا اور اس نے چلا کر کہا........ ''ڈرائیور.... گاڑی اپنی جگہ کھڑی کرو.... اور انتظار کرو....''

☆☆☆

ایکسٹرا

ننھا منا چھ سالہ عادل اپنے ضعیف ولاغر اور تنہائی میں زندگی بسر کرنے والے دادا کے ساتھ وقت گزارتا کیونکہ اسکول بند تھا.... وہ اپنے ادادا کا اکلوتا سہارا تھا، وہی اس کے لئے کھانا چائے پانی لے جاتا اور اسی کے پاس بیٹھا رہتا۔ اس کے ماں باپ کبھی کبھار ہی اس کمرے کی طرف آتے.... ننھے عادل کا دادا اونگھنے لگا تو وہ اپنے ماں باپ کے پاس آیا۔ وہ دونوں صوفے پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے.... اچانک اسکرین پر ایک شخص کو دکھایا گیا جو آج ہی فوت ہوا تھا۔

''گریٹ ایکٹر''.... عادل کے باپ نے کہا.... ''یہ کس فلم میں ہیرو تھا''.... بیوی نے پوچھا.... عادل ماں کی گود میں بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا.... وہ فلموں میں ایکسٹرا کا کام کرتا تھا.... شوہر نے جواب دیا.... ''ایکسٹرا بولے تو''.... بیوی نے کباب کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا.... شوہر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ۔ ایکسٹرا کسی فلم میں معمولی رول ادا کرتا ہے جیسے

کوئی اندھا سڑک کراس کر رہا ہو یا کسی سین میں بھیک مانگ رہا ہو.... یا جیسے کوئی شخص بوٹ پالش کر رہا ہو۔ یا کوئی شخص اکیلا بیٹھا کچھ سوچ رہا ہو یا.... اور کسی معمولی رول میں جیسے کہ.... جیسے کہ... مثال کے طور پر.... جیسے کہ.... وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ننھے عادل نے ماں کا گال دائیں ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا........ جیسے کہ میرے دادو......... ....

☆☆☆

درد

رحمٰن ڈار کے پیروں میں درد ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی اس کے پیر دبائے جیسے اس کی بیوی دبایا کرتی تھی.... اس کے پیروں میں درد بڑھتا ہی جا رہا تھا.... اچانک اسے اپنی جوانی کے دن یاد آئے.... وہ اپنے اکلوتے بیٹے امجد کے پیر تب تک دباتا رہتا جب تک وہ نیند کی دیوی کی آغوش میں نہ چلا جاتا.... اس نے بیٹے کو پکارا... ''بیٹا میرے پیروں میں بہت درد ہو رہا ہے''.... تھوڑی دیر کے لئے دبا''... ...... ابھی وہ بات پوری نہیں کر سکا کہ امجد کمرے سے باہر آیا۔

''کیا ہوا بوڑھے کو''.... بیوی نے ناگواری سے پوچھا:

''کچھ نہیں اس کے پیروں میں بہت درد ہو رہا ہے''

امجد نے الماری میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے کہا.... ''وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے پیر دباؤں''

''ارے میں تو کہتی ہوں اس کا گلا دبا دو کمبخت نے جینا حرام کر دیا ہے....''

امجد باپ کے سامنے کھڑا ہوا اور اس سے کہا:

''یہ لو ٹیوب۔ اس کی دوائی پیروں میں لگاؤ''.... یہ کہہ کر امجد چلا گیا۔ اور پھر سے اپنی بیوی کے پیر دبانے لگا.... رحمٰن ڈار بہت دیر تک دروازے کو تکتا رہا۔ وہ سینے میں عجیب سا درد محسوس کر رہا تھا......

☆☆☆

مضمون:

Afkaar-e-Sheikh Saadi Shirazi.....Ek Nazar by Dr. Mohd. Sajar

(HOD, Persian, Degree College,Kotranka,, Rajouri) cell-7006462235

ڈاکٹر محمد ساجر (صدر، شعبہ فارسی، ڈگری کالج کوٹرنکہ، راجوری)

افکارِ شیخ سعدی شیرازی۔۔۔۔۔ایک نظر

مختصر تعارف: مصلح الدین ا؎ لقب اور سعدی تخلص تھا، ان کے والد اتا بک سعد بن زنگی بادشاہ شیراز کے ملازم تھے۔ اس تعلق سے شیخ نے سعدی تخلص اختیار کیا ۲؎ سال ولادت معلوم نہیں البتہ سال وفات ۶۹۱ ھ میں لکھا جانا اور عمر کی مدت تمام تزکروں میں ۱۰۲ برس ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ولادت ۵۸۹ ھ میں ہوئی ہے ۳؎۔ جبکہ گلستان سعدی اُردو حاشیہ حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمن نے ۶۰۵ ھ لکھی ہے ۴؎۔

شیخ کی تصانیف: سعدیؔ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جن میں گلستان، بوستان کو زیادہ شہرت ملی مگر ان کے علاوہ عربی قصیدہ قافیہ میم، طیبات، بدائع، خواتیم، قصائد فارسیہ، مراثی، طمعات، مثلثات، (فارسی، عربی اور ترکی میں) قصائد عربیہ، ترجیعات، مقطعات، مجلسِ ہزل، مطائبات، رباعیات، مفردات اور غزلیات بھی ہیں

افکار سعدی: شیخ سعدی شیرازی کے افکار کو ایک مقالہ میں جمع کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے بس اپنی بساط کے مطابق ان کے چند افکار، اپنے ناظرین کی سماعتوں کے حوالے کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔ شیخ نے اپنی زندگی میں ان حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جو افراتفری کے ماحول کا باعث بنی ہوئی تھی، بادشاہ زادوں تک کو روٹی کے ٹکڑے کے لیے ترسنا دیکھا تھا اور کئی سال تک کئی ملکوں کی سیر و سیاحت کے تجربات، مسافرت کی مشکلات اور بقول رضا زادہ شفق ۵؎ شیخ ایک بے چین روح رکھتے تھے کسی ایک جگہ پابند ہو کر نہ رہے کئی ملکوں کا سفر کیا اور والد کی وفات آپ کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔ اپنی جوانی میں سعدی نے غربت اور سخت

مشکلات کا سامنا کیا اور بہتر تعلیم کے لیے آپ نے اپنے آبائی شہر کو خیر باد کہا اور بغداد تشریف لے گئے۔ آپ نے المدرسۃ النظامیہ میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے اسلامی سائنس، قانون، حکمت و فلسفہ، تاریخ، عربی ادب اور اسلامی الٰہیات کی تعلیم حاصل کی۔ سعدی شیرازی نے جامع نظامیہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد متعدد ملکوں کی سیاحت کی۔ وہ شام، مصر، عراق، انتولیا بھی گئے، جہاں بڑے شہروں کی زیارت، گاہکوں سے بھرے پر رونق بازار دیکھے، اعلیٰ درجہ کے فنون لطیفہ کے نمونوں سے محضوظ ہوئے اور وہاں کے علما اور فن کاروں سے ملاقاتیں کی۔ آخر کار وہ افراتفری کے ایام میں جنگی قیدی بھی بنے اور سات سال اس کیفیت میں گزارے۔ ایک غلام کی حیثیت سے وہ خندقیں کھودنے کے کام پر متعین رہے۔ مملوکوں نے تاوان ادا کیا، تو جنگی قیدیوں کو رہا کیا گیا۔، جن میں سعدی شیرازی بھی شامل تھے۔ قید سے رہائی کے بعد سعدی شیرازی یروشلم (بیت المقدس) چلے گئے۔ وہاں سے مکہ اور مدینہ کا رُخ کیا۔ بیس برس کی طویل مسافت کے بعد سعدی شیرازی آخر کار اپنے آبائی وطن ایران پہنچے، جہاں انھیں اپنے پرانے رفقا کی صحبت میسر آئی۔ اپنے ان افکار کو قلم کے زریعے" گلستان سعدی" میں قلمبند کیا۔

ان افکار میں شیخ نے ہمیں خداوند کریم کی حمد و ثنا کے بعد جو پیغام دیا ہے وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت کرنا اور آپ علیہ السلام کے بتائے ہوئے ہر عمل کی تکمیل کرنا ہے۔ ان کے ابیات جو مقدمہ" گلستانِ سعدی" میں درج ہیں، سے بے پناہ محبت چھلکتی ہوئی نظر آتی ہے جو شاید اتنے زمانے گزرنے کے بعد بھی اس طرح کا کلام کسی شاعر، فنکار یا عاشق رسول کے کلام میں نظر نہیں آتا جو محبت کی ان بلندیوں کو چھو سکے۔

(بیت) شفیع مطاع نبی کریم قسیم جسیم نسیم وسیم

بلغ العلے بکمالہ، کشف الدجی بجمالہ حسنت جمیع خصالہ صلو علیہ وآلہ

اور آگے لکھا ہے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

چہ غم دیوار امت را کہ دارد چوں پشتیباں

چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد نوح کشتیباں

- ان کے افکار میں عقل و خرد، سیرت کو سنوارنا، نیکوں کے ساتھ دوستی،، اپنے ہاتھ کی

کمائی سے رزق حاصل کرنا، قناعت کے فضائیل، خاموشی کے فوائد، تاثیر تربیت، کسی کو گزند نہ پہنچانا، راہ راست اختیار کرنا، عیب کو چھپانہ اور نیکیوں کو ظاہر کرنے سے گریز،، ہنر پیدا کرنے کی صلاحیت اختیار کرنا اور آداب صحبت وحکمت اور اعلی اخلاقیات کو ہر کام میں مقدم رکھنے کی تلقین جیسے افکار اپنے کلام میں شامل کیے ہیں۔ انسانی دوستی و تفکر، ہم زیستی مسالمت آمیز نیکوکاری، تعصّبات سے گریز، صداقت، تواضع، امانتداری وقناعت، عاجزی، انصاف، اور انسانی ہمدردی جیسے بنیادی اخلاقی اقدار کو مختصر اور مؤثر حکایات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں

زبان در دہان ای خردمند چیست؟ کلید در گنج صاحب ہنر
چودر بستہ باشد چہ داند کسی کہ جوہرفروش است یا پیل ور

کہتے ہیں کہ انسان کی زبان اس کی عقل علم اور اخلاق کو ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے یہ جب تک بند ہے اس کی خوبی چھپی رہتی ہے اور لیکن جب وہ بات کرتا ہے معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان جوہر فروش ہے یا پیلہ ور (قیمتی پتھر یا موتی بیچنے والا ہے یا ریشم کے کپڑے) شیخ نے نیکوں کی صحبت اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ اچھوں کی صحبت انسان کو خدا کا راستہ دکھاتی ہے اور بروں کی صحبت گمراہی اور جہنم کے راستے پر لے جاتی ہے۔ بری صحبت سے ایک پیغمبر کا بیٹا خاندان نبوت سے گم ہو جاتا ہے اور دوسری طرف ایک سگ کا شمار جنتی انسانوں میں ہو گیا یا جنتی ہو گیا۔

پسر نوح بابداں بنشست خاندان نبوتش راگم شد
سگ اصحاب کہف روز چند پیے نیکاں گرفت مردم شد

مرشد رومی نے بھی بڑی پیاری بات کی ہے اور نیکوں کی صحبت کی اہمیت اس طرح بیان کی ہے۔

صحبت صالح ترا صالح کند صحبت طالع ترا طالع کند

سعدی کو اپنے تمام افکار اور اقوال زریں کی وجہ سے بہت شہرت حاصل ہوئی ہے۔لیکن ان سب میں سے زیادہ مشہور "بنی آدم"، جو" گلستان" کا حصہ ہیں۔ان اشعار کو پوری اقوام

عالم نے آنکھوں اور دل میں بسایا ہے اس کے ساتھ ساتھ اقوام متحدہ کے داخلی دروازے پر امن اور بھائی چارے کے پیغام کے طور پر کندہ کر یا گیا ہے۔

بنی آدم اعضای یکدیگرند   کہ درآفرینش زیک گوہرند

چوعضوی بہ درد آورد روزگار   دگرعضوہا را نماند قرار

تو کز محنت دیگران بی غمی   نشاید کہ نامت نہند آدم

ان اشعار میں شیخ نے جو انسانیت کی مثال قایم کی ہے وہ کسی زبان میں موجود نہیں ہے چنانچہ فرماتے ہین کہ تمام انسانوں کو ایک ہی گوہر (مٹی) سے پیدا کیا گیا ہے وہ ایک دوسرے کے اعضا ہیں اور جب ایک اعضا (جسم کے حصے) کو تکلیف ہوتی ہے دوسرے حصوں کو قرار نہیں ہوسکتا اور اگر کوئی انسان دوسرے انسان کی تکلیف سے پریشان نہیں ہے تو شاید اس کا نام آدمی نہیں ہے۔ شیخ سعدی کے نصیحت آموز واقعات اور اشعار ہر دور میں انسانوں کی رہنمائی کرتے ہیں تا آج کے نوجوانوں کی ہمت اور بردباری کو بڑھانے میں ایک کلیدی رول اختیار کرتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ کسی امیر کے آگئے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے کہ اپنے ہاتھوں سے لوہا گرم کر کے رزق کما کر کھاییں۔ اصطلاحاً نہایت مشقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

بدستِ آہن تفتہ کردن خمیر   بہ از دستِ بر سینہ پیش امیر

شیخ ظاہر پرستی کے قایل نہیں وہ کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی نیکیاں ظاہر کر کے عیبوں کو زیر بغل نہیں کرنا چاہیے۔

ای ہنرہا نہادہ بر کفِ دست   عیب ہا برگرفتہ زیر بغل

تا چہ خواہی خریدن ای مغرور   روزِ درماندگی بسیم دغل

گلستانِ سعدی میں شیخ کی کہانیاں روزمرہ کے واقعات سے اخلاقی نتائج اخذ کرتی ہیں جو بچوں اور بڑوں دونوں کی کردار سازی کرتی ہیں اور صبر وقناعت کی تلقین کرتی ہیں۔ شیخ نے اپنے کلام میں حکمرانوں کے لیے ان کہانیوں میں نصیحت اور ظلم سے بچنے کا درس دیا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں لالچ کی مذمت کی اور قناعت (جو ملے اس پر شکر کرنے) کی تلقین کرتے ہیں۔

آج کے دور میں جہاں ایک طرف سائنس ترقی کرتے کرتے درجہ کمال تک پہنچی ہے وہاں

دوسری طرف جوان نسل کا بے راہ روی اور غیر اخلاقی اقدار میں ملوث ہونا قابل تشویش ہے ایسی صورت میں اس دور کے مفکرین پر لازم ہے کہ ایسے افکار کو پڑھیں، لکھیں اور پڑھایا جانا چاہیے ایک زمانہ تک گلستان سعدی درس نظامی اور دیگر ادارہ جات میں نصاب کا حصّہ رہی ہے۔ ذیل میں چنداشعار جو شیخ کے افکار کی عکاسی کرتے ہیں درج ہیں۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ ای اعرابی　　کین راہ کہ می دور بہ ترکستان است

فہمِ سخن چون نکند مستمع　　قوّتِ طبع از متکلّم مجوی

فُسحتِ میدانِ ارادت بیار　　تا بزند مردِ سخنگوی، گوی

گر گزندت رسد زخلق مرنج　　کہ نہ راحت رسد زخلق نہ رنج

از خدا دان خلافِ دشمن و دوست　　کاین دلِ ہر دو در تصرّفِ اوست

گرچہ تیر از کمان ہمی گذرد　　از کمان دار بیند اہلِ خرد

اس کے ساتھ شیخ اپنے کلام میں نہ صرف آدمی کی بات کرتے ہیں بلکہ آدمیت کی بھی بات کرتے ہیں جس میں انسان کے کردار، اخلاق، ہمدردی اور اعلیٰ اقدار کا مجموعہ ہے۔ انسان کی اصل پہچان اس کا شکل وصورت نہیں، بلکہ اس کی وہ خوبیاں ہیں جن کی بدولت وہ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کر سکتا ہے وہ اعلیٰ ترین اوصاف (شرافت، سچائی، رحم دلی، اور عدل) ہیں جو کسی بھی شخص کو ایک اچھا اور سچا انسان بناتی ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

تن آدمی شریف است بہ جان آدمیت　　نہ ہمین لباس زیباست نشان آدمیت

اگر آدمی بہ چشم است و دہان و گوش و بینی　　چہ میان نقش دیوار و میان آدمیت

خور و خواب و خشم و شہوت شغب است و جہل و ظلمت　　حیوان خبر ندارد ز جہان آدمیت

بہ حقیقت آدمی باش وگرنہ مرغ باشد　　کہ ہمین سخن بگوید بہ زبان آدمیت

مگر آدمی نبودی کہ اسیر دیو ماندی　　کہ فرشتہ رہ ندارد بہ مکان آدمیت

اگر این درندہ خویی ز طبیعتت بمیرد　　ہمہ عمر زندہ باشی بہ روان آدمیت

رسد آدمی بہ جایی کہ بہ جز خدا نبیند　　بنگر کہ تا چہ حد است مکان آدمیت

شیخ کے بچپن کے حالات جس قدر ہونے چاہیے تھے موجود نہیں لیکن خود ان کے کلام میں بہت سی دلچسپ باتیں موجود ہیں جو ناظرین کی توجّہ طلب ہیں اور اصلاح معاشرہ کے

لیے نہایت مفید ہیں اوران باتوں کو کئی مفکرین نے اپنی کتابوں میں اورملٹی میڈیا کے ذریعے بیان کیا ہے تاکہ ادبی دنیا میں ذوق قایم رہے چند سطور اس طرح ہیں۔ شیخ کے والد نے جب ان کو پڑھنے کا حکم دیا ایک تختی، کاغز اور انگھوٹھی خرید کر دی جو کسی نے مٹھائی دے کر لے لی۔ ان کے والد انہیں مزید محبت وتربیت کے خیال سے ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے کہ ایک دفعہ اپنے والد صاحب کے ہمراہ عید کی نماز کے لیے جا رہے تھے کہ لوگوں کی بہت بھیڑ تھی۔ اس لیے والد نے انہیں نصیحت کی کہ دیکھو بیٹا میری انگلی نہ چھوڑنا، ورنہ رش اور بھیڑ میں گم ہو جاؤ گے، لیکن راستے میں ننھے سعدی نے والد کی انگلی چھوڑ دی اور کھیل کود میں مشغول ہو گئے کھیل سے فارغ ہو کر جب والد کو قریب نہ دیکھا تو مارے خوف کے رونے لگے۔ اتنے میں والد بھی انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں آ گئے۔ کان کھینچتے ہوئے جھڑک کر فرمایا کہ نا سمجھ بچے میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ میری انگلی مضبوطی سے پکڑے رکھنا، لیکن تم نے دھیان نہیں کیا اور میرا کہا نہ مانا اور پریشانی ہوئی۔ بڑی عمر میں سعدی لوگوں کو یہ آپ بیتی واقعہ سنا کر فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم دنیا کی بھیڑ میں گم ہونا نہیں چاہتے تو کسی نیک بندے کا دامن تھام لو، ورنہ پریشانی میں ٹھوکریں کھاتے پھرو گے، جو بزرگوں کا دامن چھوڑ دیتا ہے، وہ یونہی بھٹکتا رہتا ہے۔ اس طرح کے واقعہ سے سعدی کی فکری صلاحیت کا فہم تمام ناظرین کو ہو جاتا ہے۔

سعدیؒ اپنا ایک اور واقعہ اس طرح بیان فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میرے پاؤں میں جوتا نہ تھا اور جیب میں کوئی پیسہ بھی نہ تھا کہ اس سے جوتا خرید سکوں۔ ننگے پاؤں جا رہا تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ خدا نے میرے نصیب کتنے خراب بنائے ہیں۔ اسی حالت میں چلتے چلتے کوفہ کی جامع مسجد میں جا پہنچا، وہاں ایک آدمی کو دیکھا، جس کے پاؤں ہی نہ تھے۔ میں فوراً خدا کے حضور سجدے میں گر گیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ جوتا نہ سہی، خدا تعالیٰ نے مجھے پاؤں تو دے رکھے ہیں۔ اس طرح کے واقعات محض شکر گزاری کی تلقین کے لیے شیخ نے بیان کیے ہیں۔ اپنے بچپن کا ایک اور واقعہ شیخ سعدیؒ کچھ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ایک شب کو میں اپنے والد صاحب کے ساتھ مسجد میں گیا، میرے والد ساری رات وہاں عبادت کرتے رہے، ان کے ساتھ میں بھی نماز میں مشغول ہو گیا۔ ہمارے نزدیک چند آدمی گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ یہ لوگ ایسے سو رہے ہیں، جیسے مر گئے ہوں۔ کسی نے نماز پڑھی

اور نہ دعا کی۔ والد نے کہا بیٹے اگر تو بھی نوافل نہ پڑھتا، باقی ذکر نہ کرتا اور ان لوگوں کی طرح سو جاتا تو اس سے بہتر ہوتا کہ تو ان کی برائی بیان کر رہا ہے (یعنی غیبت کر رہا ہے وغیرہ۔ ادب میں جن فکری صلاحیتوں کا تذکرہ منسوب ہے وہ شیخ کو اپنے اجداد سے ورثہ میں ملی تھی۔

حوالہ جات:

۱۔ مولوی الطاف حسین حالی حیات سعدی بحوالہ شعرالعجم حصہ دوم ص ۲۵

۲۔ تذکرہ دولت شاہی طبقہ چہارم ص ۲۰۲ بحوالہ شعرالعجم حصہ دوم ص ۲۵

۳۔ بحوالہ شعرالعجم حصہ دوم ص ۲۵

۴۔ گلستان سعدیؔ اُردو حاشیہ حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمن در پیش لفظ

۵۔ تاریخ ادبیات ایران از ڈاکٹر رضا زادہ شفق (مکمل حالات) ص ۹۲۳ تا ۹۴۳

☆☆☆

"Dard mein tairte phool : Ek Jaeza (Tabsera) Mubassir-Dr. Afzaal Aaqil

(Incharge Dept. of Urdu Bheerab Gangooly College,Kolkata)

’دردمیں تیرتے پھول‘‘: ایک جائزہ

کتاب کا نام: دردمیں تیرتے پھول

شاعر: پرویزمظفر

سن اشاعت نومبر 2025

صفحات: 240۔ قیمت:۔ 399 روپے

ناشر: مظفرحنفی میموریل سوسائٹی، منظرحنفی لیس، بٹلہ ہاؤس نئی دہلی ۵۲

مبصر: ڈاکٹرافضال عاقل کولکاتا (انچارج: شعبہ اردو بھیرب گنگولی کالج کولکاتا

غزل سوئی جذبات کا ائینہ ہوتی ہے۔غزل آپ بیتی بھی ہے جگ بیتی بھی۔غزل کا شاعراپنی ذات کو جزبنا کر پیش کرتا ہے۔وہ اپنی ذات کے حوالے سے کائنات کو پرکھتا ہے۔وہ قاری کے دل کی دھڑکن کو اپنے دل کی آواز سے قریب کرتا ہے وہ اس میں شکست ونامرادی کو درمندی کے ساتھ شگفتگی میں بدل دیتا ہے اور احساس کو نئی کیفیت سے آشنا کرنے والوں میں ایک نام پرویز مظفر کا بھی ہے۔انھوں نے نظموں کے ساتھ غزلیں بھی کہی ہیں اور اپنے ہم عصروں میں اپنے لیے اور اسلوب سے اپنی پہچان بنائی ہے۔ان کی غزلیہ شاعری کی فکری تنوع اور سادگیءاظہار ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔وہ خارجی اور باطنی احساس کو سلیقے سے برتنے کے ہنر سے خوب واقف ہیں۔اس لئے ان کے کلام میں فنی تسامحات اور ناہمواریاں بہت کم ہیں۔

پرویز مظفر نے اپنی غزلوں کے اشعار میں ’سردار کا سر کٹنا‘ ستاروں کا بےنور ہونا، اپنے ملک سے نامطمئن ہوکر دور دیش جانا اور افسردہ رہنا، انتقام کی آگ سے کھیلنا ایسے

استعارے ہیں جو قاری کو نئی علامت سے مخاطب کرتے ہیں۔غزل کے چند اشعار ملاحظہ۔

ہم کو تھا معلوم کہ وہ سردار جو ہے — کٹ جائے گا اس کا ہی سر آخر کار
چاند ستارے دیکھ لیے سب تھے بے نور — گھر آیا پرویز مظفر آخر کار
اگر پرویز ہندوستان میں نا مطمئن تھے ہم — یہاں برطانیہ میں بھی رہے افسردہ افسرہ
کڑواہٹ میں رہتا ہوں — میٹھی غزلیں کہتا ہوں
شعر ہمارے کام تو آیا — دل کو کچھ آرام تو ہے
سچ کہ سادہ پانی ہے — رنگ ملانے پڑتے ہیں
دل کے لئے نئے ستم ایجاد کر کے ہم — بیٹھے ہیں اپنے آپ کو برباد کر کے ہم
خوشبو کے دیوان بنا — پھولوں کی پہچان بنا
لگتی ہیں شیطان کی باتیں — سن سن کر احسان کی باتیں
آنسو آنسو چمک رہا ہے لہو — آنکھ سے پھر ٹپک رہا ہے لہو

انھوں نے اپنے والد محترم منظر حنفی کی زمین پر خوبصورت غزل نذر قارئین کیا ہے۔ چند شعار ملاحظہ کیجئے.

قصہ ہمارا اتنا پرانا تو ہے نہیں — کیا کیجئے گا اب وہ زمانہ تو ہے نہیں
اپنی انا سے ہم نے بھی سمجھوتا کر لیا — جیسے ہمیں کسی کو منانا تو ہے نہیں
لے دے کے اشیانہ ہمارا نظر میں ہے — ان بجلیوں کا کوئی ٹھکانہ تو ہے نہیں

تقلید و نقالی کے دور میں بھی اردو شاعری حقائق سے پُر ہے۔ اگر چہ کچھ خود ساختہ استاد، فن کو فن کی طرح برتنے میں نا کام ہیں تا ہم اپنی شاعری کو بلند و بالا کیفیات کی مثال بتا رہے ہیں۔ایسی صورت حال میں پرویز مظفر کا مجموعہ "درد میں تیرتے پھول'' ان کی ذہانت کا پتہ دے رہا ہے۔ وہ غزل اور نظم کے مزاج سے آشنا ہیں اور نئے تلازموں، نئی علامتوں اور نئی فضا کو برتنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ان کا مجموعہ شعور و احساس کا آئینہ ہے وہ قاری کو مسحور کر رہا ہے۔

پرویز مظفر کی غزلیں اور نظمیں نت نئے تجربات کا منظر نامہ میں جو انسان اور سماج کے سیاسی حالات، بے یقینی، کشمکش اور اقدار و روایات کو شکست و ریخت کا احاطہ کرتے ہوئے

ذات و کائنات کو مستحکم کر رہی ہیں۔ غزلوں کی طرح ان کی نظموں کا لہجہ بھی مربوط ہے جس میں مخصوص تقاضہ سانس لے رہا ہے۔ 'نیا سال، نیا موڑ، آخری منزل، یاد آنے لگی، وغیرہ جیسی نظمیں اپنی تہوں میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا انقلاب لگتی ہیں جو آج کے عہد اور اس کے زوال کے مسائل کو پیش کر رہی ہیں۔

ان کی نظمیں پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں یا نظم کے۔ وہ ترقی پسند، جدیدیت، حالیہ جدیدیت وغیرہ کے چکر میں شعوری ادراک کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں امکانات کی روش، روایات کی پاسداری، عصری حیثیت کا احساس اور صداقت و محبت کا پیغام ہے۔

والد کی یاد میں نظم "یاد" سے یادوں کی خوشبو انگڑائی لیتی ہے اور نئی بہار تمام مسائل اور مصائب کو سمٹ کر دل کے در پر دستک دے رہی ہے اور شاعر کو نئی فکر و سوچ سے معطر بھی کر رہی ہے۔ نظم "اپنا سایہ' جسم میں کشمکش پیدا کر رہی ہے۔ نظم ''دسمبر'' آسمان کی بلندی پر نئے جہاں آباد کر رہی ہیں اور پھر چاندنی راتوں کی خواہش دل کے دروازے پر صدا لگا رہی ہے:

''چاندنی راتوں میں''

تم کچھ کم/ پلکیں پھر بھی نم/ دل میں پھیلی چاندنی/ گھنی راتوں میں/ آنکھوں سے شبنم/ چھلکاتی کیوں ہے/ اتنی یاد آتی کیوں ہے؟

شاید اس لئے کہ زندگی کے تمام جھمیلے تنہائی کے عالم میں سانس لے رہے ہیں۔ شاعر پرویز مظفر کائنات کا طواف کرتے ہوئے ہر خاص و عام کو نئے سفر پر نکلنے کی آواز دے رہے ہیں مگر اداسی دل کی گلی میں کھڑی مسکرا رہی ہے۔ بطور مثال نظم "مسافر" اور ''اداسی''، پیش کی جا سکتی ہیں۔

پرویز مظفر اپنی نظم ''اپنائیت''، میں خواب میں خوبصورت زندگی تعمیر کرنے کا پیام دیتے ہوئے چہرے نہ بدلنے کا مشورہ دے رہے ہیں کیونکہ چہرے اور اپنے چہرے ہی زندگی کی شناخت ہوتے ہیں۔ نظم "حصار' دعوت محبت کا پیغام ہے مگر انسان کی اہمیت کو نظر میں رکھتے ہوئے نئی تصویر، نئے کائنات کی آمد کا پتہ دیتی ہے، ملاحظہ کیجئے۔

حصار: اس دائرے میں/ اس کو بھی لے لو/ تمہاری محبت میں/ وہ بھی گنگنائے گا/ مسکرائے گا/

کھلے گا کھلکھلائے گا،/خوشبو پھیلائے گا/ اگر نہیں تو پھر/ اداس رہ کر/ مرجھائے گا وہ بھی۔
نئی تصویر: اداس ہنگامے/ وہ منظر/ جب تم ہمیں/ بھر کر بانہوں میں/ یادوں میں/ وہ تصویر ابھرتی سے/ ہم جب بیٹھے رہتے ہیں/ اور ایک نئی تصویر بنتی ہے!

پرویز مظفر کی نظمیں ایک گہری اور پیچیدہ وکشمکش جہاں کی عکاسی کرتی ہیں، جہاں زندگی کے غموں اور حقیقتوں خوشیوں، یادوں اور دکھ کی کیفیات دنیا کی ترقی اور بلندی کی دعائیں دیتی ہیں۔ وہ اپنی نظموں کے وسیلے سے انسانیت کے دکھوں اور تمناؤں کے گہرے اور متنوع پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ نظم ''روپ'' میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں خوشی اور غم کو بچانے اور قانوں کی حفاظت کا طریقہ کار نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی نظم ''نظم'' میں جب تب کے استعمال سے انسان اور مخلوقاتِ کائنات کا زاویہ بتایا ہے۔ ان کے علاوہ نظم ''دھند''، "ظلم پر نظم'' کے حوالے سے انھوں نے اپنی زندگی کی جدو جہد، داخلی کشمکش، مختلف دشواریوں کی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے ''نظم'' کے حوالے سے زندگی کی مشکلات، آزمائشوں، تلخ حقیقتوں اور مسائل سے الجھے بغیر زندہ رہنے کا لائحہ عمل تیار کیا ہے۔

ان کی نظمیں مایوسی کے دامن کو چاک کر کے نئے امکانات تیار کرنے کا درس دے رہی ہیں۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے ان کی شاعری زندگی کی سختیوں، بے انصافیوں اور ظلم کے خلاف اعلان مسرت وجدو جہد کی راہ ہموار کرتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں کرب کا گہرا احساس انسان کی شخصیت کو رونق عطا کرتا ہے کہ چاند کا چہرہ پرانا ہونے کے باوجود نئے سفر واہنگ کو معتبر کرتا ہے اور داخلی حالات کو شدت عطا کرتا ہے۔ پرویز مظفر کی شاعری منفرد اسلوب کے زندہ نمونے ہیں۔ جن سے قاری اپنی حقیقت اور زندگی کے جواز کو نئے طریقے سے بازیافت کرنے کی مثال پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ نظمیں ملاحظہ کیجئے۔
روپ: دنیا میں حفاظت کا/ قانون کہاں ہے/ اگے پیچھے چلتے/ خوشی اور غم/ ہمارے غم خوار/ ایسے چپ ہیں کہ بس!
نظم: مل جائیں تب/ کہے گا جب/ باتیں آپ کی/ تب کی تب/ پانی اور آگ/ ساتھ رہے کب/ ایسا غضب/ بجلی کا تماشہ/ کیا ہوگا اب۔
دھند: یادوں کی کرچیاں/ بکھری ہیں/ دھند میں ٹہلتا مسافر/ تلاش کرتا ہے/ نظر نہ آئے کچھ/ مگر

اندر/ روشنی ہی روشنی پھیلی ہے/ دور نظر آتا ہے کچھ!

ظلم پر ظلم: دعا کے/ ہوا کے/ خیالوں کے/ اجالوں کے/ پر نکل آئے!

نظم: چاند چہرہ/ پرانا ہے/ پھر سویرا/ دل نے گھیرا/ پوچھنے لگا/ اس سے اچھا/ خواب کوئی نہیں/ دل کی بستی میں/ مسافر اکیلا تھا/ آنکھ کی کشتی میں/ اس سے اچھا/ اندھیرا ہی اندھیرا تھا!

ان کی دیگر نظمیں ''اندھیرا"، "حقوق"،''خواہش''،''خواب''، "برف''،''ہنر کی تلاش''،''تال''،''جستجو''،''رشتہ''،''آخری منزل''،''منظر بدل گیا'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن کے متعلق ارباب فن کا خیال یا آرا مستحکم اور مسلم ہیں۔ ملاحظ کیجئے:

" زندگی کی مشکلات اور آزمائشوں کے بارے میں ایک گہری حقیقت بیان کرتا ہے۔ پرویز مظفر بھی اس حقیقت کو اپنی شاعری میں شامل کرتے ہیں۔(پروفیسر شیخ عقیل احمد)

" پرویز مظفر اگر چہ شعری ہیئت کی پابندی کے قائل نظر نہیں آئے لیکن دل کی بات زبان پر لانے کا ہنر جانتے ہیں۔''(ولی عالم شاہین)

محولہ بالا الفاظ کی روشنی میں عرض کر لینے دیجئے کہ پرویز مظفر نے اپنی نظموں کے حوالے سے صرف مایوسی یا اداس کی باتیں نہیں کی ہے بلکہ نظموں کی ہیئت کو انفرادیت عطا کرتے ہوئے زندگی کے زوال، ہجرت، بے وطنی اور داخلی کشمکش کی تلخیوں کو نمایاں کیا ہے۔ بہر کیف! صوری و معنوی اعتبار سے یہ مجموعہ دیدہ زیب ہے۔ میں اس کا خیر مقدم کر رہا ہوں۔

☆☆☆